شمیمِ بلاغت

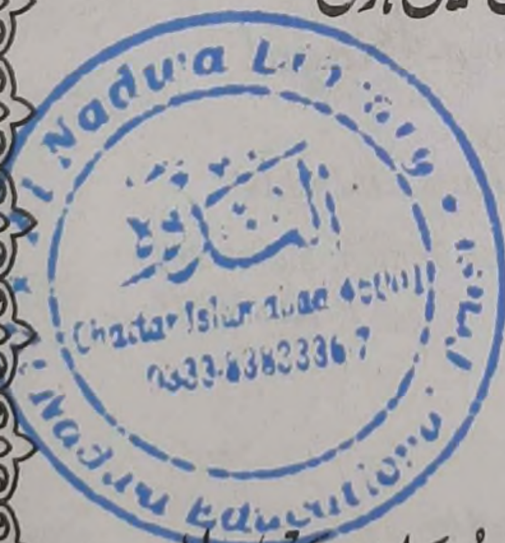
علامہ اخلاق حسین دہلویؒ

کتب خانہ انجمن ترقی اردو
۴۱۸۱ - اردو بازار، جامع مسجد، دہلی ۶

شمیمِ بلاغت

مصنّف

علامہ اخلاق حسین دہلوی



کتب خانہ انجمن ترقی اردو جامع مسجد دہلی

نام کتاب	شمیمِ بلاغت
مصنف	علامہ اخلاق حسین دہلویؒ
صفحات	۶۴
مطبع	ایم۔کے۔آفسیٹ پرنٹرز، دہلی
تعداد	ایک ہزار
طبع اوّل	۱۹۵۹ء
طبع دہم	جدید ایڈیشن مارچ ۲۰۱۲ء
قیمت	-/۳۵ روپے

Shamim-e-Blagat

by

Allama Akhlaq Hussain Dehlvi

First Edition: 1959 Tenth Edition: March 2012

Pages: 64 Price: Rs 35/-

Published by

کتب خانہ انجمن ترقی اردو جامع مسجد دہلی

Kutub Khana Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu

4181, Urdu Bazar, Jama Masjid Delhi-110006

Ph.011-23276526 Mob.9868639319,9811974979,9873674979

Email-kkatu@indiatimes.com

﴿فہرست مضامین﴾

﴿صنائع﴾

﴿اصنافِ نظم﴾

﴿اقسامِ نظم﴾ ۴۵

علم بدیع

علم بدیع وہ علم ہے جس سے کلام کی لفظی اور معنوی خوبیاں معلوم ہوں اس کی دو قسمیں ہیں۔

صنائع لفظی : لفظی خوبیوں کو صنائع یا صنائع لفظی کہتے ہیں۔

صنائع معنوی: معنوی خوبیوں کو صنائع معنوی یا بدائع کہتے ہیں۔

یہ خوبیاں کلام کے لیے زیور کا کام دیتی ہیں۔ لہذا پہلے تو کلام کا ہر اعتبار سے درست ہونا ضروری ہے۔ پھر ان خوبیوں میں سے کسی خوبی کا ہونا۔ اس کے حسن کو دو بالا کر دیتا ہے۔ یہ صنعتیں کلام میں اتفاقیہ طور پر صورت پذیر ہوتی ہیں۔ تو پُر لطف ہوتی ہیں۔ ورنہ دانستہ طور پر داخل کرنے سے کلام بے لطف ہو جاتا ہے اور مرتبے سے گر جاتا ہے

اس علم کی ایجاد کے متعلق مولوی نجم الغنی نجمیؔ رامپوری مرحوم کی تحقیق یہ ہے۔

اول جس نے ان قواعد کا نام علم بدیع مقرر کیا۔ عبداللہ بن معز عباسی ہے کہ ۲۷۴ھ میں اس نے علم بدیع کے قواعد اختراع کر کے ایک مستقل علم مقرر کیا۔

اس نے ایک کتاب میں سترہ قسم کی صنائع لکھی تھیں پھر پچھلے آنے والے اس پر اضافہ کرتے گئے۔ (صفحہ ۸۹۲ بحر الفصاحت)

اب ترقی کرتے کرتے ان کی تعداد ایکسو سترہ (۱۱۷) سے بھی بڑھ گئی ہے۔

لیکن ان میں سے زیادہ تر بے سود ہیں۔ البتہ اس علم سے کلام کی خوبیوں کے سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے اور یہی اس کا بڑا فائدہ ہے۔ یہ علم ہندی میں بھی ہے اور اس کا نام النکار ہے۔

اردو میں سب سے پہلے اس علم کو مولوی امام بخش صہبائی مرحوم نے روشن فرمایا اور اس علم سے متعلق سب سے زیادہ معلومات مولوی نجم الغنی نجمی رام پوری مرحوم نے فراہم کی ہے۔ ان دونوں بزرگوں کی کتابیں[1] اس علم میں مستند سمجھی جاتی ہیں

اخلاق حسین دہلوی
۹ اگست ۱۹۵۹ء



[1] ترجمہ حدائق البلاغت مرتبہ ۱۸۴۲ء و بحر الفصاحت تالیف ۱۸۸۶ء

بدائع

(معنوی خوبیاں)

صنعت تضاد [1] (ضد ہونا) کلام میں دو ایسے لفظ لانا جن کے معنیٰ ایک دوسرے سے مخالف اور ضِد ہوں۔ اس کی دو قسمیں ہیں :-

(ا) ایجابی۔ وہ تضاد ہے جس میں دو لفظوں کے معنیٰ ایک دوسرے کے ضِد ہوں مگر حرف نفی نہ ہوں [2]۔ مثلاً۔

گھٹانا وصل کی شب کا بڑھانا روزِ ہجراں کا ۔۔۔ یا اور کچھ اس چرخ کو آیا تو یہ آیا

گھٹانا اور بڑھانا۔ وصل و ہجر اور شب و روز میں تضاد ایجابی ہے۔ کیوں کہ یہ آپس میں ایک دوسرے کی ضد بھی ہیں اور ان میں کوئی حرف نفی بھی نہیں ہے۔

(ب) سلبی۔ وہ تضاد ہے جس میں دو لفظوں کے معنیٰ ایک دوسرے کی ضِد ہوں اور ان میں سے ایک لفظ کے ساتھ حرف نفی ہو اور دوسرے کے ساتھ نہ ہو۔ مثلاً۔

شب وصل ہوتا سبب کوئی ایسا ۔۔۔ کہ آکر یہاں اس کو جانا نہ ہوتا

ہوتا اور نہ ہوتا میں تضاد سلبی ہے کیوں کہ پہلے لفظ کے ساتھ حرف نفی نہیں ہے اور دوسرے کے ساتھ ہے

(۲) تدبیج [1] (آراستہ کرنا) تعریف یا ہجو میں مختلف رنگوں کے نام ہونا۔ مثلاً۔

---

[1] اس کو طباق۔ مطابقت۔ تطبیق اور تکافو بھی کہتے ہیں۔ [2] نہ۔ نے۔ نہیں اور مت وغیرہ حرف نفی ہیں

اس سے لے کر جام۔ رنگ اپنا ہوا سرخ وسفید

اور بزمِ دل رُبا میں منہ ہوئے کتنوں کے زرد

سُرخ وسفید اور زرد میں تدبیج ہے۔

(۳) مقابلہ۔ (سامنے آنا) کلام میں دو یا دو سے زیادہ ایسی چیزوں کو لانا جن کے معنیٰ میں ضِد نہ ہو۔ پھر ایسی چیزیں لانا جن کے معنیٰ پہلی چیزوں کے ضِد ہوں۔ مثلاً

ترکِ مطلب نے کیا ہے بے نیاز ہاتھ کھینچا پانوں پھیلاتے ہیں ہم

ہاتھ کھینچا ایک حصہ ہے ہاتھ اور کھینچا کے معنیٰ میں ضِد نہیں ہے۔ پھر پانوں پھیلانا ہے ہاتھ کے مقابل پانوں ہے اور کھینچا کے مقابل پھیلا ہے اور ان میں باہم ضِد ہے۔ مقابلہ بھی تضاد ہی کی ایک قسم ہے۔

(۴) ایہام ۲۔ (وہم میں ڈالنا) کلام میں ایسا لفظ لانا جس کے معنیٰ ہوں۔ ایک (قریب) پاس کے اور دوسرے (بعید) دور کے۔ اور کسی پوشیدہ قرینے (طریقے) سے معنیٰ بعید مراد ہوں۔ مثلاً

بستے ہیں ترے سایہ میں سب شیخ و برہمن آباد ہے تجھ سے ہی تو گھر دیر و حرم کا

سایہ کے ایک معنیٰ ہیں چھانوں۔ دوسرے معنیٰ ہیں طرف داری اور حمایت۔ یہاں دوسرے معنیٰ مراد ہیں جو بعید ہیں اور پوشیدہ قرینے سے ظاہر ہوتے ہیں۔

(۵) ایہامِ تناسب۔ (مناسبت کی وجہ سے وہم میں پڑنا) کلام میں ایسے دو لفظ لانا

---

۱ اسے تدمیج بھی کہتے ہیں۔ ۲ اس کو توریہ جدا کرنا بھی کہتے ہیں۔ بعض علمائے بدیع نے ایہام توریہ و ایہام تناسب کو ایک ہی تصور کیا ہے۔ (معیار البلاغت صفحہ ۴۶)

جن میں سے ایک لفظ کے دو معنیٰ ہوں ۔ایک مقصود ہوں دوسرے غیر مقصود اور معنیٰ غیر مقصود کو (جو مراد نہ ہوں) دوسرے لفظ کے معنیٰ سے مناسبت ہو۔ مثلاً۔

اے عندلیب تو ہے پڑھی بوستاں تلک
عالم ہوں علم عشق کا میں ۔کر نہ ہمسری

بوستان باغ کو کہتے ہیں اور یہ معنیٰ کہ تجھے بوستان (باغ) تک کی معلومات ہے اس سے آگے کچھ نہیں جانتی یہ معنیٰ مقصود ہیں اور چونکہ بوستاں ایک کتاب کا نام بھی ہے اس اعتبار سے یہ معنیٰ کہ تو نے بوستاں کتاب تک پڑھا ہے یہ معنیٰ غیر مقصود ہیں جو یہاں مراد نہیں لیکن ان معنیٰ کہ بھی دوسرے لفظ پڑھی سے مناسبت ہے۔

چشم نم آئے تھے دامن تر چلے
شیخ کی مانند ہم اس بزم میں

۶ ۔ایہامِ تضاد ۔(ضِد کی وجہ سے وہم میں پڑنا) کلام میں ایسے دو لفظ لانا جن میں سے کسی ایک کے دو معنیٰ ہوں ۔ایک مقصود (مراد) ہوں اور دوسرے غیر مقصود اور جو غیر مقصود ہوں وہ کسی دوسرے لفظ کے معنیٰ کے ساتھ تضاد کا تعلق رکھتے ہوں۔ مثلاً۔

کھلتا نہیں ۔کس طمع پہ ہے تو
بولا جب اس نے باندھے بازو

کھلتا کے دو معنیٰ ہیں ۱ ۔ظاہر ہونا اور یہ معنیٰ مقصود ہیں ۲ ۔بندھے ہوئے کے خلاف ہونا اور یہ معنیٰ غیر مقصود ہیں ۔اور ان ہی کو دوسرے لفظ (باندھے) کے ساتھ تضاد کا تعلق ہے۔

۷ ۔مراعات النظیر[۱] ۔(مثال کی رعایت رکھنا) ایسی چیزیں لانا جن میں تضاد کے علاوہ کوئی اور مناسبت ہو۔ مثلاً۔

---

[۱] اسے تناسب توفیق ۔ائتلاف اور تلفیق بھی کہتے ہیں۔

پتہ پتہ ۔ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

۸۔تشابہ الاطراف۔(دونوں طرفوں میں مشابہت ہونا) کلام کو ایسے لفظوں پر ختم کرنا جن کے معنیٰ کلام کے پہلے حصہ سے مناسبت رکھتے ہوں۔مثلاً

زباں گنگ ہے عشق میں کان بہرے　　　بُرا سنئے ۔ بھلا کہتے کہتے

کہتے کہتے کا تعلق زبان سے ہے۔پہلے زبان ہے اور کلام کے آخر میں کہتے کہتے ہے اور اسی بنا پر دونوں اطراف میں مشابہت ہے۔

(۹) حُسنِ تعلیل۔(خوبی کا سبب) کسی خوبی کے ظاہر کرنے کے لیے کسی چیز کا وہ سبب بتانا جو دراصل اس کا سبب نہ ہو۔مثلاً

پیاسی جو تھی سپاہِ خدا تین رات کی
ساحل سے سر پٹکتی تھیں موجیں فرات کی

نہیں ہے بے سبب پھولوں کا کھلنا زربکف ہوکر
خراجِ حسن لیتی ہے زمیں بھی کوئے جاناں کی

بعض پھولوں میں زرد رنگ کے بیج ہوتے ہیں ان کے زرد ہونے کا سبب یہ بتایا ہے کہ محبوب کی گلی کی زمین بھی حسین ہونے کا ٹیکس لیتی ہے جسے ادا کرنے کے لیے پھول زربکف نکلے ہیں یعنی ہاتھوں میں سونا لیے ہوئے ہیں۔سونا زردی مائل ہوتا ہے اس لیے زرد بیجوں کو سونے سے تشبیہہ دی ہے مگر یہ سبب ہے نہیں۔بلکہ خوبی پیدا کرنے کے لیے یہ سبب قرار دیا ہے۔

(۱۰) تجاہلِ عارفانہ۔ کسی نکتے یا خوبی کے پیدا کرنے کے لیے جان بوجھ کر انجان بنا۔ مثلاً۔

صنم کہتے ہیں تیرے بھی کمر ہے　　کہاں ہے کس طرف ہے اور کدھر ہے

یہ جانتے ہوئے کہ ہر شخص کے کمر ہوتی ہے لیکن پھر بھی انجان بن کر دریافت کرتا ہے اور اس انجان بننے سے کمر کی باریکی میں مبالغہ منظور ہے۔

(۱۱) مشاکلت۔ (ہم شکل ہونا) پہلے دو چیزوں کے ذکر کا ارادہ کریں پھر ایک ہی جگہ ہونے کی وجہ سے اس میں سے ایک کے لیے ایسا لفظ لائیں جو معنیٰ میں دوسرے سے مشابہت رکھتا ہو۔ مثلاً۔

میں وہ رونے والا جہاں سے چلا ہوں　　جسے ابر ہر سال روتا رہے گا

مینھ برسنے کے لیے ابر کا رونا استعمال کیا ہے جو رونے والے سے معنوی مشابہت رکھتا ہے۔

(۱۲) مزاوجت۔ (دو چیزوں کا ملانا) کلام میں شرط اور جزا کا ہونا یعنی دو معنوں کو اس طرح بیان کرنا کہ جو اثر پہلے سے ہو وہی دوسرے سے ہو۔ مثلاً۔

آہ کیجئے تو آن جاتی ہے　　اور نہ کیجئے تو جان جاتی ہے

آہ کرنا اور نہ کرنا دو چیزیں ہیں اور ان دونوں میں سے ہر ایک سے ایک چیز (آن یا جان) کا جانا ضروری قرار دیا ہے۔

(۱۳) اِرصاد[۱]۔ (نگہبان بٹھانا) کلام کے آخری حصہ سے پہلے ایسا لفظ لانا جس

---

[۱] اس کو تسہیم (دھاری دار چادر بننا) بھی کہتے ہیں اور نثر میں بھی اس سے کام کیا جاتا ہے۔

سے یہ معلوم ہو جائے کہ آخری حصّہ (قافیہ یا لفظ) کیا ہوگا۔ مثلاً۔

کیا قہر ہے۔ وقفہ ہے ابھی آنے میں انکے — اور دم مرا جانے میں توقُّف نہیں کرتا
تا صاف کرے دل نہ مے صاف سے صوفی — کچھ سودِ صفا علمِ تصوف نہیں کرتا

پہلے شعر میں وقفہ اور توقُّف اور دوسرے شعر میں صاف اور صوفی یہ بتارہے ہیں کہ پہلے شعر کے قافیے کی رعایت سے دوسرے شعر کا قافیہ تصوف ہوگا۔

(۱۴) رجوع۔ (واپس ہونا) کلام میں پہلے کوئی خوبی بیان کریں پھر کسی نکتے یا فائدے کی غرض سے اس کو غلط قرار دیں اور ایسی خوبی بیان کریں جو اس سے بہتر ہو۔ مثلاً۔

وہ آنکھیں کہ آہو پہ جادو چلائیں — نہ آہو پہ۔ جادو پہ جادو چلائیں

پہلے کسی حسین کی آنکھوں کو ہرن کی آنکھوں سے ترجیح دی اور جادو کہا پھر جادو سے رجوع کیا اور جادو سے بھی بڑھا دیا ہے۔ یہاں رجوع سے یہ فائدہ ہوا کہ حسین کی آنکھوں کو ہر اعتبار سے فوقیت حاصل ہوگئی ہے۔

(۱۵) اِستخدام۔ (طلبِ خدمت) کلام میں ایک ایسا لفظ لانا جس کے دو معنیٰ ہوں پہلے ایک معنیٰ مراد لیں پھر ضمیر کی مدد سے دوسرے معنیٰ مراد لیں۔ مثلاً۔

ملے مجھ سے تو فرمایا تمھی کو داغ کہتے ہیں — تمھی ہو ماہِ کامل میں تمھی رہتے ہو لالہ میں

پہلے داغ سے مراد داغ شاعر ہے پھر تم ضمیر کی مدد سے سیاہ داغ مراد لیا جو چاند میں اور لالہ کے پھول میں ہوتا ہے۔

(۱۶) لف ونشر۔ (لپیٹنا اور بکھیرنا) کلام میں پہلے کئی چیزیں لائیں پھر بلا تعین[1]

---

[1] مقرر کیے بغیر

ان کے مناسبت ومتعلقات لائیں۔اس کی دو قسمیں ہیں۔

(ا) لف ونشر مرتب۔ پہلے کئی چیزیں لائیں پھر اسی ترتیب سے (جیسے وہ چیزیں لائے ہیں) ان کے مناسبت لائیں۔ مثلاً۔

تیرے رخسار وقد وچشم کے ہیں عاشقِ زار　　گل جدا۔سرد جدا۔نرگس بیمار جدا

رخسار کے مناسب گل ہے۔قد کے مناسب سرد ہے اور عاشقِ زار کے مناسب نرگس بیمار ہے اور یہ ترتیب سے ہیں۔

(ب) لف ونشر غیر مرتب۔ پہلے کئی چیزیں لائی پھر ان کے مناسبات لائیں مگر ان میں ترتیب نہ ہو بلکہ کسی کا مناسب پہلے ہو اور کسی کا پیچھے۔مثلاً۔

باہم دگر ہوئے ہیں دل ودیدہ پھر رقیب　　نظارہ وخیال کا ساماں کئے ہوئے

دل کے مناسب خیال ہے جو بعد میں آیا ہے اور دیدہ (آنکھ) کے مناسب نظارہ ہے جو پہلے آیا ہے گویا کہ مناسبات میں ترتیب نہیں ہے

(۱۷) جمع ۔(اکٹھا کرنا) کلام میں کئی چیزوں کو ایک سی حالت میں یا ایک ہی حکم میں جمع کرنا۔مثلاً۔

بوئے گل۔نالہ دل۔دودِ چراغِ محفل　　جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

بو، نالہ اور دود یعنی تینوں چیزوں کو ایک ہی حالت پریشانی میں اکٹھا کر دیا ہے۔

(۱۸) تفریق -(فرق کرنا) کلام میں ایک ہی قسم کی دو چیزوں میں فرق ظاہر کرنا۔مثلاً

عشق میں نسبت نہیں بلبل کو پروانے کے ساتھ

وصل میں وہ جان دے یہ ہجر میں جیتی رہے

بلبل اور پروانے کے عشق میں یہ فرق ظاہر کیا ہے کہ پروانہ عشق میں جان دیتا ہے اور بلبل عشق میں مرتی نہیں۔

(۱۹) تقسیم۔(بانٹنا) کلام میں پہلے کئی چیزیں لائیں پھر تعین [1] کے ساتھ ان کے مناسبات لائیں۔مثلاً

تیرا ہنسنا میرے رونے کے برابر ہو گیا　　اُس نے مارا خلق کو اس نے ڈبویا اک جہاں

ضمیر اُس اور اِس نے ہنسنے کے ساتھ مارا کو اور رونے کے ساتھ ڈبویا کو مقرر کر دیا ہے مارا ہنسنے کے مناسب ہے اور ڈبویا رونے کے مناسب ہے۔

فرق۔تقسیم اور لف و نشر میں یہ فرق ہے کہ تقسیم میں مناسبات تعین کے ساتھ ہوتے ہیں اور لف و نشر میں مناسبات تعین کے ساتھ نہیں ہوتے۔

(۲۰) جمع و تفریق۔کلام میں پہلے کئی چیزوں کو ایک حالت میں جمع کرنا پھر ان کا فرق بتانا۔مثلاً

کم نہیں جلوہ گری میں تیرے کوچے سے بہشت
یہی نقشہ ہے۔ولے اس قدر آباد نہیں

پہلے محبوب کے کوچے اور بہشت کو جلوہ گری میں یکساں قرار دیا ہے پھر یہ فرق بتایا ہے کہ بہشت اس قدر آباد نہیں ہے جس قدر محبوب کا کوچہ آباد ہے۔

(۲۱) جمع و تقسیم۔کلام میں پہلے کئی چیزوں کو ایک حالت میں جمع کرنا پھر تعین کے ساتھ ان کے مناسبت کو لانا۔مثلاً

---

[1] مقرر کر کے یا خصوصیت کے ساتھ

دوست [1]اکرتے ہیں ملامت غیر کرتے ہیں گلہ

کیا قیامت ہے مجھی کو سب بُرا کہنے کو ہیں

بُرا کہنے میں سب کو یکساں قرار دیا ہے اور ایک حالت میں جمع کر دیا ہے پھر مناسبت کو تعین کے ساتھ تقسیم کر دیا ہے کہ دوست ملامت کرتے ہیں اور دشمن گلہ کرتے ہیں۔

(۲۲) جمع وتفریق و تقسیم۔ کلام میں ان تینوں چیزوں [2] کو ایک جگہ جمع کرنا، اس طرح کہ پہلے گئی چیزوں کو ایک حالت میں جمع کریں پھر ان میں فرق بتائیں اور پھر مناسبت کو تعین کے ساتھ تقسیم کر دیں۔ مثلاً۔

صورتِ یار دلِ زار ہیں دونوں تاباں   آتشِ عشق سے یہ حُسن سے ہے وہ روشن

روشنی اس کی تو پہنچاتی ہے راحت دل کو   اور اس آگ سے جاتا ہے جلا اپنا بدن

پہلے مصرع میں جمع ہے۔ دوسرے میں تفریق ہے۔ تیسرے اور چوتھے میں تقسیم ہے۔

(۲۳) تجرید۔ (الگ کرنا) ایک خوبی والی چیز سے اسی جیسی ایک اور چیز حاصل کریں تاکہ پہلی چیز اپنی خوبی میں کامل سمجھی جائے۔ مثلاً۔

مجھ کو طعنے دیتے دیتے کیوں پشیماں ہو گئے   آئینے میں تم نے کیا دیکھا کہ حیراں ہو گئے

محبوب کی شکل اتنی پیاری ہے کہ اسے دیکھ کر عاشق تو حیران تھا ہی لیکن جب آئینے میں اس کا عکس پڑا اور وہ صورت رونما ہوئی تو محبوب خود اسے دیکھ کر حیران اور پشیمان ہو گیا اور سمجھا کہ واقعہ میں عاشق کی حیرانی بجا ہے۔ اور اس خیال سے کہ وہ اسے بیجا سمجھتا

---

[1] پہلے دوسرے مصرع کا مطلب لینا چاہیے اور پھر پہلے کا۔ [2] جمع وتفریق و تقسیم

تھا اسے پشیمانی بھی ہوئی۔ اس بیان سے محبوب کی خوبصورتی میں مبالغہ منظور ہے۔

(۲۴) مبالغہ۔ (انتہا کو پہنچانا) کلام میں کسی بات کو اتنا بڑھا کر بیان کرنا کہ برائی یا بھلائی میں کوئی کسر باقی نہ رہے۔ اس کی تین قسمیں ہیں۔

(ا) تبلیغ۔ (پہنچانا) وہ مبالغہ جو عقلاً بھی ممکن ہو اور عادتاً بھی۔ مثلاً

وعدۂ شام پہ کی ہم نے عبث جاگ کے صبح   وہ اسی وقت نہ آتے اگر آنا ہوتا

یہ بات عقل اور عادت کے اعتبار سے ممکن ہے کہ کسی کے انتظار میں کوئی رات بھر جاگتا رہے۔

(ب) اغراق۔ (وہ مبالغہ جو عقلاً ممکن ہو اور عادتاً ممکن نہ ہو۔ مثلاً

مقدور ہے کس کا جو ترے حکم کو ٹالے   رستم جو نہ آوے تو وہیں اس کا سر آوے

رستم کی بہادری کا لحاظ رکھتے ہوئے اس کا سر کاٹ لانا ایسا کام ہے جو روزمرہ کے کاموں کی طرح نہیں ہو سکتا اس لیے عادتاً ناممکن ہے لیکن عقلاً یہ ممکن ہے کہ کوئی اس کا سر کاٹ لائے۔

تبلیغ اور اغراق مبالغے کی یہ دونوں قسمیں مقبول ہیں اور انوکھی خوبیوں میں گنی جاتی ہیں۔

(ج) غلو۔ (حد سے گزرنا) وہ مبالغہ جو عقل اور عادت دونوں کے لحاظ سے ناممکن ہو۔ مثلاً

اے ہمالہ اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں   چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں

یہ بات عقلاً اور عادتاً ناممکن ہے کہ آسمان ہمالہ پہاڑ کی چوٹی کو چومے۔

(۲۵) مذہب کلامی[1] (متکلمین کا طریقہ) کلام کو علمائے متکلمین کی طرح علم منطق[2] کے قاعدے کے مطابق دلیل سے آراستہ کرنا۔ مثلاً

اگر عدم سے نہ ہو ساتھ فکر روزی کا   تو آب و دانہ کو لے کر گوہر نہ ہو پیدا

گوہر (موتی) کی وضع کو دانے سے اور چمک دمک کو آب (پانی) سے تشبیہ دی ہے۔ اگر عدم سے روزی کا فکر نہ ہوتا تو گوہر آب و دانہ کے ساتھ نہ آتا لیکن چوں کہ گوہر آب و دانہ کو ساتھ لے کر پیدا ہوا ہے اس لیے یہ ثابت ہے کہ روزی کا فکر عدم ہی سے ساتھ ہے۔

(۲۶) مذہب فقہی۔ (فقہ دریافت کرنا) علم فقہ کے عالموں کی طرح کسی سوال کو اُس طرح حل کرنا جس طرح اس جیسا اور کوئی سوال حل کیا جا چکا ہو۔ مثلاً۔

میں نے جو کہا تو ذرا سا ہے دلا!   کیسے غمِ بسیار نے کی تجھ میں جا

دل بولا آنکھ بھی ہے ایک چھوٹی سی شے   اور اس میں سما جاتا ہے دیکھ کیا کیا

دل کا قیاس آنکھ پر کیا ہے اور اس طرح اس سوال کو حل کر دیا ہے اور یہ طریقہ علم فقہ کے عالموں کا ہے۔

(۲۷) تاکید المدح بما یشبہ الذم۔ (بڑائی کے طور پر تعریف کرنا) کلام میں کسی کی تعریف اس طرح کرنا کہ بظاہر بُرائی معلوم ہو لیکن دراصل تعریف مراد ہو۔ مثلاً

حُسن ہے بیشک ترا ہے عیب اے رشک پری

۱؎ علمِ کلام ایک علم کا نام ہے۔ جس میں ہر بات کو عقل کی روشنی میں سمجھا کر بیان کیا جاتا ہے اس علم کے عالموں کو اہلِ کلام یا علمائے متکلمین کہتے ہیں اور وہ علمِ منطق سے کام لیتے ہیں اور مذہب طریقے کو کہتے ہیں۔

۲؎ علم منطق وہ علم ہے جس کے قاعدوں کو یاد رکھنے سے ذہن اور فکر غلطی سے محفوظ رہتا ہے

پر ضرور اتنا تو نقصاں ہے کہ تو مغرور ہے

مغرور ہونا حسینوں کا وصف ہے اور اس وصف کو ظاہر کرنا مقصود ہے لیکن بظاہر اسے بُرائی کی صورت میں بیان کیا ہے۔

(۲۸) تاکید الذم بمایشبہ المدح۔ (تعریف کے طور پر بُرائی کرنا) کلام میں کسی کی بُرائی اس طرح کرنا کہ بظاہر تعریف معلوم ہو لیکن دراصل بُرائی یا ہجو مراد ہو۔ مثلاً۔

فلک بے بہرہ آب و خور سے کب رکھے غریبوں کو
مگر کھانے کو غم، خونِ جگر پینے کو دیتا ہے

اس تعریف کے پردے میں کہ آسمان غریبوں کو کھانے اور پینے سے محروم نہیں رکھتا یہ بُرائی کی ہے کہ وہ کھانے کو غم اور پینے کو خونِ جگر دیتا ہے۔ یہ بُرائی ہے اور اسی کو ظاہر کرنا مقصود ہے۔

(۲۹) اِدماج [۱]۔ (لپٹنا) کلام میں کسی بات کو اس طرح بیان کرنا کہ ایک مطلب سے کوئی دوسرا مطلب بھی حاصل ہو۔ مثلاً۔

رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم — مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دُور

اس بیان سے ایک مطلب تو یہ نکلتا ہے کہ پردیس میں مرنے سے زیادہ ذلت نہیں ہوئی اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ پردیس میں مرنے سے بیکسی کی تکمیل ہوگئی۔ فرق اِدماج اور ایہام میں فرق یہ ہے کہ ایہام میں ایک لفظ کے دو یا زیادہ معنیٰ ہوتے ہیں اور اِدماج میں پورے کلام سے دو معنیٰ نکلتے ہیں۔

---

[۱] اِدماج کو ذوالمعنین بھی کہتے ہیں

(۳۰) اِستتباع۔ (پے در پے لانا) کلام میں کسی کی تعریف اس طرح کرنا کہ اس سے ایک اور تعریف پیدا ہو جائے۔ مثلاً۔

زِیرِ راں تیرے ہے وہ توسنِ چالاک کہ تو
چھیڑ دے ایک ذرا اس کو جو وقت صف جنگ
یوں کرے جست کہ جیسے سر میدانِ نبرد
منہ سے اُڑ جائے حریفوں کے ترے خوف سے رنگ

ان شعروں میں گھوڑے کی تعریف ہے۔ مگر اس سے محبوب کی تعریف بھی نکلتی ہے اور وہ یہ کہ جس کا گھوڑا ایسی خوبیوں کا مالک ہو وہ خود کیسا بہادر اور ہنر مند ہوگا۔

فرق۔ اِدماج اور اِستتباع میں یہ فرق ہے کہ استتباع میں تعریف کا ہونا ضروری ہے لیکن اِدماج میں تعریف کا ہونا ضروری نہیں۔ صرف دو مطلب ہونے کی شرط ہے۔ اس لیے استتباع خاص ہے اور اِدماج عام ہے۔

(۳۱) توجیہہ۔ (منہ پھیرنا) کلام میں دو مختلف مطلبوں کا ہونا یعنی کسی ایک کلام سے دو ایسے مطلب نکلیں جو ایک دوسرے کی ضِد ہوں۔ مثلاً۔

سر اڑانے کے جو وعدے کو مکرر چاہا ہنس کے بولے کہ ترے سر کی قسم ہے مجھ کو

قسم ہے نے دو معنیٰ پیدا کر دیئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہم نے وعدہ کیا ہے اس لیے ہم سر ضرور کاٹیں گے۔ دوسرے یہ کہ ہم ہرگز سر نہیں کاٹیں گے جیسے کہتے ہیں ”تمھیں تو ہمارے ہاں آنے کی قسم ہے“ یعنی کبھی نہ آؤ گے۔

فرق (۱)۔ توجیہہ اور اِدماج میں یہ فرق ہے کہ توجیہہ خاص ہے اور اِدماج عام

ہے یعنی توجیہہ میں ایک معنیٰ دوسرے معنیٰ کی ضِد ہوتے ہیں۔ لیکن اِدماج میں دو معنیٰ ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کی ضِد نہیں ہوتے۔

فرق (۲)۔ توجیہہ اور ایہام میں یہ فرق ہے کہ توجیہہ میں دو مخالف معنیٰ ہوتے ہیں جو پورے کلام سے پیدا ہوتے ہیں اور ایہام میں ایک لفظ کے دو معنیٰ ہوتے ہیں اور ان میں مخالف و موافق کی شرط بھی نہیں ہوتی۔

(۳۲) ہزل بمعنیٰ جدا[1]۔ (صحیح بات مذاق کے رنگ میں) کلام کا بظاہر مذاق کے رنگ میں ہونا لیکن دراصل مذاق یا تمسخر نہ ہو بلکہ صحیح اور سنجیدہ بات مراد ہو۔ مثلاً

نازاں نہ ہو جیو زنِ دنیا کی چاہ پر   کچھ کا اعتبار نہیں بے وفا ہے یہ

دنیا کو زن دنیا کہہ کر مذاق کا پہلو اختیار کیا ہے لیکن بات صحیح ہے کہ دنیا بے وفا ہوتی ہے

(۳۳) قولِ بالموجب۔ (فرضی بات) کلام میں ایسے لفظ کا ہونا جس کی مدد سے کلام کا وہ مطلب سمجھ کیا جائے جو دراصل کہنے والے کا مطلب نہ ہو۔ مثلاً

جب کہا ان سے کہ مرتا ہوں تو ہنس کے بولے
منہ تو دیکھو۔ یہ بڑے آئے ہیں مرنے والے

مرتا ہوں کہنے سے مراد یہ تھی کہ میں تم پر عاشق ہوں۔ مگر محبوب نے اس کے اصلی معنیٰ مراد لیے ہیں یعنی دنیا سے گزرتا ہوں اور موت کے منہ میں جاتا ہوں جو دراصل کہنے والے کا مطلب نہیں ہے۔ غالب کا یہ شعر بھی اسی قسم کا ہے۔

---

[1] ہزل اور استہزا میں یہ فرق ہے کہ ہزل میں بظاہر مذاق کا رنگ ہوتا ہے اور حقیقت میں صحیح بات مراد ہوتی ہے اور استہزا میں بظاہر ہر ٹھیک بات ہوتی ہے لیکن مراد تمسخر اور مذاق ہوتا ہے۔

میں کہا کہ بزمِ ناز چاہیئے غیر سے، بھی
ہنس کر ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

(۳۴) اِطراد۔ (آگے چلانا) کلام میں جس کی تعریف کی جائے اس کے باپ دادا کا نام بھی لایا جائے۔ مثلاً۔

تھے موتی لال کے بیٹے جواہر لال پنڈت جی
جو ہندوستان کے محبوب رہبر اور ہمدم تھے

ہندستان کے ہر دل عزیز وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کے والد بزرگوار کا نام پنڈت موتی لال نہرو تھا۔

(۳۵) تعجب۔ کلام میں کسی فائدے یا غرض کے لیے تعجب یا حیرت کو ظاہر کرنا۔ مثلاً

زخم کھایا زہر کھایا تو بھی کچھ ہوتا نہیں　　عمر گزری موت کو کیا جانیئے کیا ہو گیا

موت کے نہ آنے پر تعجب کا اظہار کیا ہے۔ فائدہ یہ ہے کہ عاشق کو زہر کھا لینے سے بھی موت نہیں آتی۔

(۳۶) حشو[۱]۔ (بھرتی یا زیادتی) کلام میں ایسا زائد لفظ یا جملہ لانا کہ اگر وہ نہ ہوتو بھی مطلب پورا ہو جائے۔ اس کی تین قسمیں ہیں۔

۱۔ حشو ملیح (نمکین زیادتی) کلام میں ایسا زائد لفظ یا جملہ لانا جس سے کلام میں خوبی پیدا ہو جائے اور اس کے حُسن میں چار چاند لگ جائے اور لطف دوبالا ہو جائے۔ مثلاً

حضرتِ ناصح سے یہ کہہ دو کہ اب کیا کیجئے　　دل جو تھا بندہ خدا کا سو بتوں کا ہو رہا

---

[۱] اس کو اعتراض بھی کہتے ہیں اور نحو کی اصطلاح میں جو جملہ زائد ہوتا ہے اسے جملہ معترضہ کہتے ہیں

یہ جملہ کہ 'جو تھا بندہ خدا کا' حشو ملیح ہے کیوں کہ مطلب صرف یہ ہے کہ دل بتوں کا ہو رہا' لیکن بتوں کی مناسبت سے یہ ذکر 'جو تھا بنداہ خدا کا' لطف سے خالی نہیں ہے۔ حشو ملیح [1] سے کلام کا حُسن دوبالا ہو جاتا ہے اس لیے یہ بہت کا آمد ہے۔

(ب) حشو متوسط۔ (درمیانی بھرتی) کلام میں ایسا زائد لفظ یا جملہ لانا جس سے کلام میں نہ کوئی خوبی پیدا ہو اور نہ کوئی خرابی اور نہ وہ اپنے مرتبہ سے گرنے پائے۔ مثلاً ؎

اے جہانِ جود و ہمت پیاس کو میری بجھا
تو ہے بحرِ بیکراں میں تشنہ و تفسیدہ لب

تشنہ و تفسیدہ میں سے اور جود و ہمت میں سے ایک ایک لفظ حشو متوسط ہے۔

(ج) حشو قبیح۔ (بری بھرتی) کلام میں ایسا زائد لفظی جملہ لانا جس سے کلام میں خرابی پیدا ہو جائے لطف کم ہو جائے اور وہ مرتبے سے گر جائے۔ مثلاً ؎

روئے آنسوں اس قدر ہم ہجر میں
اشک کے طوفاں سے دریا ہو گیا

اس میں لفظ آنسو حشو قبیح ہے جس سے شعر کا سارا مزا کرکرا ہو گیا ہے اگر یہ مصرع اس طرح ہوتا تو یہ عیب پیدا نہ ہوتا۔

اس قدر روتے رہے ہم ہجر میں

حشو قبیح کا شمار عیوب میں ہوتا ہے یہاں ضمناً ذکر کیا ہے۔

(۳۷) تفسیر۔ (کھول کر بیان کرنا) کلام کے حصے میں ایسے لفظ لانا جن سے مطلب صفائی سے ادا نہ ہو پھر دوسرے حصے میں ایسے لفظ لانا جن سے مطلب صفائی سے ادا ہو

---

[1] مولانا صہبائی مرحوم لکھتے ہیں "حشو ملیح کہ حُسنِ کلام کا موجب ہے کثیر الوقوع ہے"۔ صفہ ۸۹ حدائق البلاغۃ۔

جائے۔ مثلاً۔

کیا غضب لین دین ہے ظالم　　　لیتا ہے دل تو دیتا ہے غمِ ہجر

'لین دین' کا مطلب واضح نہیں تھا دوسرے مصرع میں اسے واضح کر دیا ہے اور وہ یہ کہ دل لیتا ہے اور غمِ ہجر دیتا ہے۔

(۳۸) تلمیح۔(ہلکی سی نظر ڈالنا) کلام میں کسی مشہور قصے یا کسی مسئلے یا کسی تمثیل یا کسی علمی اصطلاح یا کسی تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ کرنا۔ مثلاً۔

ابن مریم ہوا کرے کوئی　　　میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی

ابن مریم یعنی حضرت عیسیٰؑ کے معجزے کی طرف اشارہ ہے کہ وہ خدا کے حکم سے بیماروں کو تندرست اور مردوں کو زندہ کر دیا کرتے تھے۔

(۳۹) عکس وتبدیل۔(ادل بدل) کلام میں جو حصّہ پہلے ہوا سے پیچھے لانا اور جو پیچھے ہوا سے پہلے لانا۔ مثلاً۔

خفا کیوں صنم ہے۔نہیں بھید کھلتا　　　نہیں بھید کھلتا۔خفا کیوں صنم ہے

پہلے مصرع کا پہلا جملہ تبدیل ہو کر دوسرے مصرع کے آخر میں آ گیا ہے اور پہلے مصرع کا دوسرا جملہ دوسرے مصرع کے شروع میں آ گیا ہے اور یہی عکس وتبدیل ہے۔

(۴۰) براعت الاستہلال[1]۔(اظہار کی رعایت) کلام کے شروع میں ایسے لفظ لانا جو آنے والے مطلب سے مناسبت رکھتے ہوں اور ان سے آنے والے مطلب کی طرف اشارہ پایا جائے۔ مثلاً۔

---

[1] اس کو حسن مطلع بھی کہتے ہیں۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

سچ ہے دنیا میں شبِ ہجر بلا ہوتی ہے دم بدم آرزوئے مرگ سوا ہوتی ہے

آئندہ شہادت اور قتل کا ذکر آنا ہے۔ لہذا آرزوئے مرگ سے اس مطلب کی طرف اشارہ ہوتا ہے اور یہ لفظ اس مضمون سے مناسبت رکھتے ہیں۔

(۴۱) ایرادِ مثل [۱] (کہاوت لانا) کلام میں کسی مشہور مثل (کہاوت) کو لانا تاکہ مطلب خوب ظاہر ہو جائے۔ مثلاً ؎

چوہے نو سو کھا کے چلی حج کو بلّی بڑی نیک بندی بڑی پارسا ہے

نو سو چوہے کھا کے بلّی حج کو چلی۔ یہ مشہور کہاوت ہے جو پہلے مصرع میں آئی ہے

(۴۲) اقتباس [۲]۔ (فائدہ اُٹھانا) کسی کے مشہور کلام کو اپنے کلام میں ملانا یا نقل کرنا۔ مثلاً ؎

غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے۔ بقول ناسخؔ آپ بے بہرے ہے۔ جو معتقد میرؔ نہیں

دوسرا مصرع ناسخؔ لکھنوی کا مشہور مصرع ہے جو غالبؔ نے اپنے کلام میں شامل کر لیا ہے۔

(۴۳) سوال و جواب۔ کلام میں آپس کی بات چیت یا سوال و جواب کا ہونا۔ مثلاً ؎

پوچھا کہ طلب۔ کیا قناعت پوچھا کہ سبب کہا کہ قسمت

دونوں مصرعوں میں پہلے سوال ہے اور پھر جواب ہے۔

(۴۴) التفات۔ (توجہ کرنا) کسی شخص کا یا کسی چیز کا ذکر کبھی بطور غائب کبھی بطور حاضر اور کبھی بطور متکلم کے کرنا۔ مثلاً ؎

---

[۱] اس کو ارسالِ مثل بھی کہتے ہیں [۲] اس کو تضمین بھی کہتے ہیں۔

حاضر ہوا ہے در پہ ترے اک شکستہ حال ظلمِ جہاں سے جس کا کلیجہ ہے داغ دار
میں آپ کے حضور میں آیا ہوں ملتجی گھیرے ہوئے ہے گردشِ گردونِ کج مدار

ان شعروں میں ایک ہی شخص کا ذکر کئی طرح آیا ہے۔ گویا کہ مختلف پہلوؤں سے توجہ کی ہے۔

(۴۵) اِدّعا۔ (دعویٰ بے دلیل) ناممکن بات کا اس طرح دعویٰ کرنا کہ وہ ٹھیک اور ممکن معلوم ہو۔ مثلاً

منہ تکا ہی کرے ہے جس تس کا حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا

آئینے کے بے حرکت ہونے کو حیرت سے تعبیر کیا ہے اور منہ تکنے سے مراد لوگوں کا منہ دیکھنا ہے جس کو منہ تکنا کہہ سیا ہے۔ حالاں کہ آئینہ کسی کا منہ نہیں تکا کرتا مگر اس بے دلیل دعوے کو اس طرح بیان کیا ہے کہ وہ ممکن معلوم ہونے لگا ہے۔

(۴۶) مناظرہ۔ (نظر ڈالنا بحث کرنا) کلام میں کسی کے قول کو غلط ثابت کرنا۔ مثلاً

ایک روز آسماں یہ پکارا کہ اے زمیں میرے حضور خاک تری آبرو نہیں
یہ بولی کج نہاد ہے اے چرخِ سر نگیں یہ بانکپن ملا ہے۔ نہ یہ صورت تری حسیں

گویا کہ ہر ایک نے دوسرے کی بات کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

(۴۷) سحرِ حلال۔ (جائز جادو) کلام میں ایک یا کئی لفظ ایسے لائیں جو پہلے کلام کے خاتمے کو ظاہر کرتے ہوں اور ان سے آنے والے کلام کی ابتدا بھی ظاہر ہوتی ہو۔

پڑھتا ہے شراب پی کے لاحول ناظمؔ رندوں میں پارسا ہے

لاحول سے پہلے یہ خیال ہوتا ہے کہ شراب کے چھوڑنے کا ذکر ہے لیکن دوسرے

مصرع نے بتایا کہ وہ ایسا ہی کرتا ہے۔ اور لاحول ترکِ شراب کے لیے نہیں بلکہ لگاتار عمل کے اظہار کے لیے ہے۔ مومن نے کیا خوب کہا ہے۔

رواں فزائے سحر حلال مومن سے
رہا نہ معجزہ باقی لب بتاں کے لیے



صنائع

(لفظی خوبیاں)

(ا) صنعت تجنیس [1]۔ (یکساں کرنا) بولنے یا لکھنے میں لفظوں کا ایک جیسا ہونا اور معنی میں مختلف ہونا۔ اس کی کئی قسمیں ہیں۔

(ا) تجنیس نام (پوری یکسانیت) کلام میں دو ایسے لفظوں کا ہونا جو بولنے میں لکھنے میں، حرفوں کی ترتیب میں، حرفوں کی گنتی میں اور حرکت [2] وسکون میں یکساں ہوں اور معنی میں مختلف ہوں۔ مثلاً

چمن میں کس نے الٰہی نگاہ ڈالی آج
جو کھل کھلاتی ہے گل کی ہر ایک ڈالی آج

پہلے مصرع میں 'ڈالی' ڈالنا مصدر سے ہے اور نگاہ ڈالی سے مراد دیکھنا ہے اور دوسرے مصرع میں 'ڈالی' کے معنی ہیں شاخ گویا کہ لفظ یکساں ہیں مگر معنی میں فرق ہے

(ب) تجنیس مرکب۔ (لفظ ملا کر یکساں کرنا) کلام میں ایسے دو لفظوں کا ہونا۔ جن میں سے ایک مفرد (اکیلا) ہو۔ اور دوسرا مرکب یعنی کسی اور لفظ سے مل کر اس جیسا بنا ہو اس کی تین قسمیں ہیں۔

---

[1] اس کو جناس بھی کہتے ہیں [2] زیر، زبر اور پیش کو حرکت کہتے ہیں اور حرکت نہ ہونے کو سکون کہتے ہیں اُردو میں حرفوں پر حرکت نہیں لکھی جاتی مگر پڑھنے میں آتی ہے۔

ا۔ تجنیس متشابہ (یکسانی کا شبہ ہونا) بولنے اور لکھنے میں دونوں یکساں ہوں مگر ایک مفرد ہو اور دُوسرا مرکب۔ مثلاً

جتنے مرمر گئے بتوں! تم پر ‏ ‏ اُن کے مرقد ہیں سنگِ مرمر کے

پہلے مصرع میں مرمر مرکب ہے جو مرنا مصدر سے ہے اور دوسرا مصرع میں مرمر مفرد ہے۔ جو پتھر کی ایک قسم ہے۔

۲۔ تجنیس مفروق (فرق کی ہوئی یکسانیت) کلام میں دو ایسے لفظوں کا ہونا جو بولنے میں یکساں ہوں مگر لکھنے میں یکساں نہ ہوں۔ مثلاً

کہا جی نے یہ ہجر کی رات ‏ ‏ یقیں ہے صبح تک دے گی نہ جینے

پہلے مصرع میں جی نے مرکب ہے جو جی اور نے سے مل کر بنا ہے اور الگ الگ لکھا جاتا ہے۔ دوسرے مصرع میں جینے مفرد ہے جو جینا مصدر سے بنا ہے اور مل کر لکھا جاتا ہے گویا کہ بولنے میں یکساں ہے مگر لکھنے میں یکساں نہیں ہے۔

۳۔ تجنیس مرفو (جڑی ہوئی یکسانیت) کلام میں ایک لفظ مفرد اور مکمل ہو اور دوسرا بھی ایسا ہی ہو مگر یکساں کرنے کے لیے کسی اور لفظ کا کوئی حرف اس میں جوڑ لیا گیا ہو۔ مثلاً

غُل تھا کہ اب مصالحت جسم و جاں نہیں ‏ ‏ لو تیغ برق دَم کا قدم درمیاں نہیں

برق دَم میں سے قاف لے کر دم سے ملایا اور اسے بھی قدم کا ہم پلہ بنا دیا۔
(اس قسم کی صنعتیں بیکاری ہیں)

(ج) تجنیس مُحرّف۔ (ترچھی یکسانیت) کلام میں دو ایسے لفظ لانا جو لکھنے میں

یکساں ہوں لیکن بولنے میں حرکت وسکون میں اور معنی میں الگ الگ ہوں۔ مثلاً۔

گلے سے لگتے ہی جتنے گلے تھا بھول گئے　　　دگرنہ یاد تھیں مجھ کو شکاتیں کیا کیا

گَلے اور گِلے میں حرکت میں فرق ہے کہ گَلے میں گ پر زبر ہے اور گِلے میں زیر ہے لکھنے میں دونوں یکساں ہیں۔ لیکن بولنے میں اور معنی میں دونوں الگ الگ ہیں۔

(د) تجنیس مکرر[1] (بار بار کی یکسانیت) کلام میں ایک جیسے دو لفظوں کا لگاتار آنا۔ مثلاً۔

دیکھتی گل کی ہے بہار بہار　　　پھول لاکھوں ہیں اور ہزار ہزار

بہار بہار اور ہزار ہزار لگاتار آئے ہیں ایک بہار کے معنی ہیں موسم دوسری بہار کے معنی ہیں رونق اور سجاوٹ۔ اسی طرح ایک ہزار کے معنی ہیں بلبل اور دوسرے ہزار کے معنی ہیں گنتی میں سو کا دس گنا ہونا۔

(ہ) تجنیس زائد یا ناقص (زائد یا اَدھوری یکسانیت) کلام میں دو یکساں سے لفظوں میں سے کسی میں ایک حرف زیادہ ہو یا کسی میں ایک حرف کم ہو۔ مثلاً۔

اس کے قامت پہ قیامت کا کرو گر میں خیال
کب قیامت نے بھلا پائی ہے یہ حشر کی چال

قیامت میں قامت سے ایک حرف زیادہ ہے اس اعتبار سے تجنیس زائد ہے اور قامت میں سے ایک حرف کم ہے اس اعتبار سے تجنیس ناقص ہے۔

---

[1] اس کو تجنیس مُزدَوَج (ملی ہوئی یکسانیت) بھی کہتے ہیں۔

(و) تجنیس مضارع (یکسانیت میں مانند ہونا) کلام میں دو لفظوں کا حرفوں کی گنتی میں حرکت وسکون میں اور وزن میں یکساں ہوں نا۔ لیکن ایک حرف بدلا ہوا ہو۔ اور وہ لفظ بھی ایسا ہی ہو جو ادا کرنے میں قریب ہی سے ادا ہوتا ہو۔ مثلاً

عقل میں شمس ہے تو علم میں کانِ گوہر　　فضل میں کعبہ ہے تو حلم میں کوہِ رحمت

علم اور حلم گنتی میں حرکت وسکون میں اور وزن میں یکساں ہیں۔ لیکن صرف ایک حرف بدلا ہوا ہے اور وہ بھی پاس ہی سے ادا ہوتا ہے اس لیے ایک لفظ دوسرے کے مانند معلوم ہوتا ہے۔

(ز) تجنیس لاحق [1] (پچھلی یکسانیت) ہم جنس لفظوں میں ایک سے زیادہ حرفوں کا مختلف نہ ہونا۔ مثلاً

واں بال سی وہ کمر ہے باریک　　یاں آنکھوں میں دو جہاں ہے تاریک

باریک اور تاریک میں تجنیس لاحق ہے۔ ت، ب کے سوا سب حرف یکساں ہیں

(ح) تجنیس خطی (تحریر یکسانیت) کلام میں ایسے دو لفظوں کا ہونا جو تحریری صورتوں میں یا لکھنے میں یکساں سے ہوں مگر لفظوں میں اور حرکت وسکون میں فرق ہو۔ مثلاً

کھل گئی ہم پر کہ زندوں سے کہیں بگڑی ہے آج
سر پہ ہے پگڑی جو تیرے زاہدا بگڑی ہوئی

پگڑی اور بگڑی میں تجنیس خطی ہے۔ لفظوں اور حرکتوں کا فرق ہے۔

---

[1] اتنا اضافہ اور ہونا چاہئے کہ آخری حرف کا ہم جنس ہونا ضروری ہے ورنہ تجنیس لاحق اور تجنیس مضاری میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ تاہم اس قسم کی صنعتیں بے سود ہیں۔ اخلاق

(ط) تجنیس قلب (الٹی یکسانیت) کلام میں دو لفظوں کے حرفوں کا گنتی میں یکساں ہونا اور ایک ہی طرح کا ہونا مگر ترتیب میں ایک دوسرے سے بالکل الٹ ہوں۔ اس کی دو صورتیں ہیں۔

ا۔ قلب کل (پورا الٹ پھیر) کلام میں دو لفظ ہوں جن میں سب حروف یکساں ہوں لیکن ترتیب وار ایک دوسرے سے بالکل الٹ ہوں۔ مثلاً

دنیا میں ہے خزانہ لڑائی کا گھر سدا ۔۔۔ از روئے غور گنج کو جو الٹو تو جنگ ہے

گنج میں اور جنگ میں حروف یکساں ہی ہیں لیکن ترتیب وار اُلٹے ہوئے ہیں۔

۲۔ قلب بعض (کچھ اُلٹ پھیر) کلام میں دو لفظ ہوں جن میں حروف سب یکساں ہوں۔ لیکن کچھ حروف ایک میں دوسرے سے اُلٹے ہوئے ہوں۔

اُٹھ گیا پاس اب قرابت کا ۔۔۔ رشتہ پیدا ہوا رقابت کا

قرابت اور رقابت میں ایک حرف اُلٹا ہوا ہے۔ پورے حروف بٹے ہوئے نہیں ہیں اس لیے یہ قلب بعض ہے۔

(ی) اشتقاق (نکلنا) ایک ہی مادّے یا ایک ہی مصدر سے کئی لفظ نکال کر کسی جملے یا شعر میں لانا۔ مثلاً

دن کٹا فریاد میں اور رات زاری میں کٹی ۔۔۔ عمر کٹنے کو کٹی پر کیا ہی خواری میں کٹی

کٹا اور کٹی اور کٹنے ایک ہی مصدر سے مشتق ہیں۔

(ک) شبہ اشتقاق (نکلنے کا شبہ) کلام میں ایسے الفاظ لانا جو ایک ہی مادّے یا مصدر سے نکلے ہوئے معلوم ہوں۔ لیکن اصل میں وہ ایک مادّے یا مصدر سے نکلے

ہوئے نہ ہوں۔ البتہ ایک مادّے سے مشتق ہونے کا شبہ ہوتا ہو۔ مثلاً

نہ بیٹھیں گے چلّے میں چلاّنے والے　　　نہ ہوں گے گوشہ نشیں ترے شیدا

چلّے اور چلاّنے ایک ہی مصدر سے نکلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اصل میں یہ الگ الگ ہیں۔ چلّہ چالیس دن کو کہتے ہیں۔ اور چلاّنے چلاّنا مصدر سے نکلا ہے اور اس کے معنی ہیں چیخنا۔

کبھی کئی لفظ ایک ہی مصدر سے مشتق (نکلے ہوئے) ہوتے ہیں لیکن ان کے معنی مختلف ہوتے ہیں۔ انھیں بھی شبہ اشتقاق ہی کہتے ہیں۔ مثلاً

نکتہ مشتاق یار ہے اپنا　　　شاعری نو شعار ہے اپنا

شاعری کے معنی ہیں شعر کہنا اور شعار کے معنی ہیں طریقہ۔ اور یہ دونوں ایک ہی مصدر سے نکلے ہیں۔ لیکن مختلف معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔

(ل) ترصیع (مرصع ہونا جڑاؤ ہونا) کلام کے پہلے حصہ میں جس وزن اور قافیے کے لفظ لائیں دوسرے حصّے میں بھی اسی وزن اور قافیے کے لفظ لائیں۔ مثلاً

ہمت نے مری مجھے اڑایا　　　غفلت نے تری تجھے چھڑایا

ہمت کے مقابلے میں غفلت ہے۔ نے کے مقابلے میں نے ہے۔ میری کے مقابلے میں تیری ہے۔ مجھے کے مقابلے میں تجھے ہے اور اڑایا کے مقابلے میں چھڑایا اور یہ سب لفظ ہم وزن اور ہم قافیہ ہیں۔

(۲) رد العجز علی الصدر[1] جو لفظ دوسرے مصرعؑ کے آخر میں ہو وہی پہلے مصرع

---

[1] شاعر پہلے دوسرا مصرع کہتا ہے اور پھر پہلا مصرع کہتا ہے۔ فن شاعری میں پہلے (صفحہ ۳۵ سے

کے شروع میں لانا۔ خواہ پورا رکن ہو یا ادھورا ہو۔ مثلاً

خط نامہ بر کو پھیر دیا اور یہ کہا   کہنا کہ ہم نے جان لیا مدعائے خط

لفظ خط عجز میں بھی ہے اور صدر میں بھی ہے۔ (بعض علمائے بدیع نے اس کی سولہ قسمیں لکھی یں جو بے جا طوالت سے خالی نہیں ہیں)

(۳) لزوم مالا یلزم ۲؎۔ کلام میں کسی ایسی چیز کو ضروری ٹھہرالینا جو اصل میں ضروری نہ ہو۔ اس کی کئی قسمیں ہیں۔

(ا) مہمل ۳؎ (نقطہ دار نہ ہونا) کلام میں ایسے لفظ لانا جن میں نقطہ دار حروف نہ ہوں مثلاً۔

ہم طالع ہُما مراد رسا ہوا

اس مصرع مین تمام حروف ایسے ہیں جن میں نقطہ نہیں ہے

(ب) منقوطہ (نقطہ دار) کلام میں ایسے لفظ لانا جن کے ہر حرف میں نقطہ ہو۔ مثلاً

آگے) مصرع کے پہلے رکن کو مصدر کہتے ہیں اور پہلے ہی مصرع کے آخری رکن کو عروض کہتے ہین اور درمیانی حصے کو حشو کہتے ہیں۔ مثلاً۔

خط نامہ	بر کو پھیر دیا اور	یہ کہا	کہنا کہ	ہم نے جان لیا	مدعائے خط
صدر	حشو	عروض	ابتدا	حشو	عجز

(وزن) مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن

تفصیل کے لئے میری کتاب فن شاعری ملاحظہ ہو۔ اخلاق دہلوی

۲؎ اسکو اعنات (اپنے کو سخت کام میں ڈالنا) بھی کہتے ہیں۔ ۳؎ اسکو غیر منقوطہ بھی کہتے ہیں۔

بخشش فیض جشن تخت نشینی

(ج) رقسطا (سفید و سیاہ دھبے) کلام میں ایسے لفظ لانا جن میں ترتیب وار ایک حرف نقطہ دار ہو اور دوسرا نقطہ دار نہ ہو۔ مثلاً

دیے صبا بوئے رُخ جاناں کی

(د) خیفا (ایک آنکھ کا سیاہ اور دوسری کا سفید ہونا) کلام میں ایسے لفظ لانا جن میں ترتیب وار ایک لفظ میں نقط دار حرف ہوں اور دوسرے لفظ میں (نقطہ دار حرف) نہ ہوں۔ مثلاً

شب کو جشن سرور تخت رہا

شب جشن اور تخت ایسے لفظ ہیں جن میں لفظ دار حرف ہیں اور سرور اور رہا ایسے لفظ ہیں جن میں لفظ دار حرف نہیں ہیں۔

(ہ) فوق النقاط [1] (نقطوں کا اوپر ہونا) کلام میں ایسے لفظ لانا جن میں اگر نقطے والے حرف ہوں تو ایسے ہوں جن میں اوپر نقطے ہوں۔ مثلاً

مظہر صدق و صفا قدر شناسِ عالم

(و) تحت النقاط [2] (نقطوں کا نیچے ہونا) کلام میں ایسے لفظ لانا جن میں اگر نقطے والے حرف ہوں تو ایسے ہوں جن میں نیچے نقطے ہوں۔ مثلاً

چمکی کبھی گری کبھی ہر رو سیاہ پر

(ز) مقطع الحروف [3] (کٹے ہوئے حروف والا) کلام میں ایسے لفظ لانا جن کے

---

[1] اس کو فوقانیہ بھی کہتے ہیں۔ [2] اس کو تحتانیہ بھی کہتے ہیں۔ [3] اس کو صرف مقطع بھی کہتے ہیں۔

حرف الگ الگ لکھے جائیں اور ملے ہوئے نہ لکھے جائیں۔ مثلاً۔

اے آدم زاد واہ واہ

(ج) موصّل (ملے ہوئے) کلام میں ایسے لفظ لانا جن کے حرف ملے ہوئے لکھے جائیں الگ الگ نہ ہوں۔ مثلاً

عشق میں بھی ہیں بلائیں کیا کیا

(ط) واسع الشفتین (ہونٹوں کا کھلا رہنا) کلام میں ایسے لفظ لانا جن کے پڑھنے میں ہونٹ آپس میں ملیں نہیں بلکہ کھلے رہیں۔ مثلاً

ٹھنڈے ٹھنڈے چلے تو چل نکلے

(ی) واصل الشفتین (ہونٹوں کا ملا رہنا) کلام میں ایسے لفظ لانا جن کے پڑھنے میں ہونٹ کھلیں نہیں بلکہ ملے رہیں۔ مثلاً

میرا ممدوح امیر ابن امیر ابن امیر

(ک) ذوقافیتین [1] (دو قافیے ہونا [2]) کلام میں دو دو قافیے لانا۔ مثلاً۔

جاتی رہے عقل اور ہوئے اوسان کنارے

دن رات یہ کیوں ہوتے ہیں قربان تمھارے

اوسان اور قربان قافیے ہیں اور کنارے اور تمھارے بھی

(ل) ذوقافیتین مع الحاجب (دو قافیوں کے درمیان پردہ) کلام میں دو ایسے قافیے لانا جن کے درمیان ردیف [3] ہو۔ مثلاً۔

---

[1] اس کو ذوقوافی بھی کہتے ہیں [2] وہ ہم وزن لفظ جو شعر کے آخر میں آئیں اور مستقل نہ ہوں [3] وہ مستقل لفظ یا حرف جو قافیے کے بعد آتے ہیں۔

کہیں آنکھوں سے خوں ہو کر بہا　　کہیں دل میں جنوں ہو کر رہا

خون اور جنون ـ بہا اور رہا قافیے ہیں اور ان کے درمیان ہو کر ردیف ہے۔

(۴) مُتلوّن (رنگ برنگ کا ہونا) کلام میں اس طرح نظم کرنا کہ وہ دو بحروں یا دو وزنوں میں پڑھا جا سکے۔ مثلاً

جب سے وہ مجھ سے جدا گلفام ہے　　چین ہے دل کو نہ آرام ہے

یہ شعر دو بحروں میں پڑھا جا سکتا ہے جن کے وزن یہ ہیں۔

(۱) فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن (۲) مفتعلن مفتعلن فاعلن

(۵) سیاقۃ الاعداد (گنتی چلانا) کلام میں اعداد (ہندسی سے) یا گنتی کا لانا۔ مثلاً

رہ روِ راہِ محنت کا خدا حافظ ہے　　اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں

دو اور چار عدد ہیں۔

(۶) تلمیع (روشن کرنا چمکانا) شعر میں ایک مصرع کا ایک زبان میں ہونا۔ اور دوسرے مصرع کا دوسری زبان میں ہونا۔ مثلاً

عصر نو ہے۔ زندگی نو تجھے درکار ہے　　خرقہ پارینہ تا کے کجادق حذر

(۶) توشیح (آرائش کرنا) ایسے کئی شعر لانا جن کے پہلے مصرع کے پہلے حرف کو یا ہر مصرع کے پہلے حرف کو جمع کیا جائے تو کوئی نام یا کوئی عبارت بن جائے۔ مثلاً

دلیٔ مرحوم ہاں اے مخزنِ علم و ہنر　　تجھ کو بھی یاد ہے وہ عہد فیروزی اثر

لوافگن نوریزدانی تھا تیری خاک سے　　کوکب اقبال تھا عالم پہ تیرا جلوہ گر

لطف تیرا عام تھا یونان و مصر و روم پر　　کیا ہوا کیوں ہو گئی محفل تری زیر و زبر

یوں شریک نالہ سامانی ہوا اخلاق میں مرثیہ دلی کا ہے اپنی کہانی سر بسر

ان شعر کے پہلے مصرع کے پہلے حرف کو جمع کر لیا جائے تو لفظ دِلّی بن جائے گا۔

(۸) مُعَمّا (پوشیدہ) کلام میں ایسے لفظ لانا جن میں سے کسی لفظ سے یا کسی حرف سے کسی پوشیدہ چیز کی طرف اشارہ کیا جائے اور اس اشارے کے سہارے کوئی نام یا کوئی عبارت بن جائے۔ مثلاً

ہم اُلٹی بات اُلٹے یار اُلٹا بنے کیوں کر کہ ہے سب کام اُلٹا

لفظ اُلٹا کے اشارے نے بتایا ہے کہ ہم کا اُلٹا مہ ہے۔ بات کا اُلٹا تاب ہے اور یار کا اُلٹا رائے ہے اور اس سے "مہتاب رائے" نام بنتا ہے۔

(۹) تنسیق الصفات (صفات کا انتظام) کلام میں ایسے لفظ لانا جن سے ایک چیز یا ایک شخص کی کئی صفتیں ظاہر ہوں۔ مثلاً

تیری شمشیر بر خصم پہ ہے۔ میدان میں صاعقہ و برقِ بلا۔ قہر خداوند تعال

دوسرے مصرع میں تین صفتیں ہیں جو ایک ہی تلوار کی ہیں۔

(۱۰) مُسَمَّط (موتیوں کی لڑی) غزل یا قصیدہ کے اشعار میں (مطلع کے علاوہ) قافیے سے پہلے کچھ ہم وزن فقرے (سجع) لانا۔ مثلاً

سر چشمہ ہمت ہے وہ۔ سر دفتر رحمت ہو وہ
سرمایۂ دولت ہے وہ۔ یا عزت و جاہ و حشم
بخشے یہاں تک سیم و زر۔ سب بھولیں گردوں کے ستم

حشم و ستم قافیہ ہے اور ہم وزن فقرے اشعار میں بخوبی واضح ہیں۔

(۱۱) نثر میں سجع (قمری کی آواز) وہ نثر جس کے پہلے فقرے کے تمام لفظ دوسرے فقرے کے تمام لفظوں سے وزن میں اور آخری حرف میں موافق ہوں۔ اس کی تین قسمیں ہیں۔

(ا) سجع مطرف (بجی ہوئی قمری کی آواز) وہ نثر جس کے فقروں کے لفظ وزن میں مختلف ہوں اور آخری لفظ کے آخری حرف یکساں ہوں۔ مثلاً

دل بتلائے ہجر یار۔ اور سینہ غمِ عشق سے فگار ہے

یار و فگار کا وزن الگ الگ ہے لیکن آخری حرف یکساں ہے۔

(ب) سجع متوازی (قمری کی آواز میں برابری) وہ نثر ہے جس کے دو فقروں کے آخری دو لفظوں کا وزن اور آخری حرف یکساں ہوں۔ مثلاً

میں تجھ پر جان دیتا اور اپنے سر بلا لیتا ہوں

دیتا اور لیتا ہم وزن بھی ہیں اور آخری حرف بھی یکساں ہیں۔

(ج) سجع متوازن [۱] (ہم وزن قمری کی آواز) وہ نثر ہے جس کے دو فقروں کے آخری لفظ ہم وزن ہوں اور آخری حرف الگ الگ ہوں۔ مثلاً

روح ایک جوہر لطیف ہے اور مجھ کو بہت عزیز ہے

لطیف و عزیز ہم وزن ہیں اور آخری حرف (یعنی ف اور ز) الگ الگ ہے۔

(۱۲) نظم میں سجع (نظم میں قمری کی آواز) کسی مصرع میں کسی کا نام اس طرح نظم کرنا کہ لطف پیدا ہو جائے۔ (یہ سجع مُہر یا نگینے میں بطور یادگار لکھا جاتا ہے۔ مثلاً۔

محمد گھیسا کا سجع ہے۔ سب تیل محمد گھی سا   محمد کالے کا سجع ہے۔ نام محمد کالے

---

[۱] اس کو موازنہ بھی کہتے ہیں

اصنافِ نظم

مُبادیات

(۱) شعر۔ وہ کلام ہے جو کہنے والے نے نظم کے ارادے سے کہا ہو۔ وزن والا ہو۔ قافیے والا ہو اور اثر والا ہو۔ مثلاً۔

زندگی کے واسطے حسنِ عمل درکار ہے   ہستی موہوم کی ہیں ورنہ تفسیریں بہت

(۲) مصرع۔ آدھے شعر کو مصرع کہتے ہیں (دو مصرعوں کا ایک شعر ہوتا ہے)۔

قوم ہے زندہ وہی عزت کا جس کو پاس ہے

(۳) بیت۔ یوں تو ہر شعر کو بیت کہتے ہیں لیکن اصل میں مثنوی کے ہر شعر کو بیت کہتے ہیں جس کے دونوں مصرعوں میں قافیہ ہوتا ہے۔

ہوا ٹھنڈی ٹھنڈی سہانا سماں   خدا کی تجلی سے روشن جہاں

(۴) فرد۔ وہ شعر جو شاعر نے ایک ہی کہا ہو اور وہ کسی غزل یا کسی قصیدے وغیرہ کا شعر نہ ہو۔

میں وہ گلشن کہ فروغِ مے سے   گل بداماں ہے۔ جوانی میری

(۵) مطلع۔ وہ شعر جس کے دونوں مصرعوں میں قافیہ ہو اور وہ کسی غزل یا قصیدے کا پہلا شعر ہو مثنوی کی بیت نہ ہو۔

ہر چیز پر بہار تھی ہر ذرہ طور تھا   المختصر شباب سراپا سرور تھا

(۶) حُسنِ مطلع ۔ پہلے مطلع کے بعد کبھی ایک اور کبھی زیادہ مطلع ہوتے ہیں ۔ انھیں حُسنِ مطلع کہتے ہیں ۔

(۷) مقطع ۔ وہ شعر جس میں شاعر اپنا تخلص لاتا ہے اور یہ غزل یا قصیدے وغیرہ کا آخری شعر ہوتا ہے ۔

(۸) تخلص ۔ وہ مختصر سا نام جو شاعر شعر میں لانے کے لیے رکھ لیتے ہیں ۔ کبھی خود رکھ لیتے ہیں اور کبھی استاد تجویز کرتا ہے اور کبھی یہ اصل نام کا جز بھی ہوتا ہے ۔

(۹) استاد و شاگرد ۔ جب کوئی شخص شاعری شروع کرتا ہے تو وہ کسی اچھے شاعر کا شاگرد ہو جاتا ہے اور اپنے شعر استاد کو دکھاتا ہے ۔ استاد شعر کے وزن اور زبان کی غلطیاں نکال دیتا ہے ۔ شاعری کے نکتے بتاتا ہے اور خیال کو سلجھا کر ادا کرنے کا سلیقہ سکھاتا ہے جس سے کمال حاصل ہوتا ہے ۔ لیکن کبھی کبھی شاگرد اپنی طبعیت کی اُفتاد کے خلاف استاد کا رنگ اختیار کرنے کی کوشش کرنے لگتا ہے جس سے اس کی طبیعت کے زور اور فطری خوبی کو نقصان پہنچتا ہے ۔ اور شاعر نقال بن جاتا ہے ۔

(۱۰) قافیہ ۔ وہ ہم وزن الفاظ جو ہر شعر کے آخر میں ہوتے ہیں اور مطلع یا بیت کے دونوں مصرعوں کے آخر میں ہوتے ہیں اور اگر ردیف بھی ہوتی ہے تو اس سے پہلے ہوتے ہیں اور مستقل نہیں ہوتے ۔

(۱۱) ردیف ۔ وہ مستقل لفظ یا حرف جو شعر میں قافیے کے بعد آتے ہیں ۔ مثلاً

یہی دل سوزِ الفت ہیں یہی جانِ محبت ہیں
انھیں مخمور آنکھوں میں نہاں سارا افسانہ ہے

فسانہ اور زمانہ وغیرہ قافیہ ہے اور ہے ردیف ہے

(۱۲) بحر و وزن۔ شعر کے ناپنے اور تولنے کے لیے جو پیمانے مقرر ہیں انھیں بحر یا وزن کہتے ہیں۔ یہ کچھ مقررہ الفاظ ہیں جن پر شعر کو تولا جاتا ہے۔ جیسے

فاعلاتن، مفاعیلن، فاعلن

(۱۳) تقطیع [1]۔ شعر کے تولنے کے عمل کو تقطیع کہتے ہیں۔ کیوں کہ بحر کے الفاظ پر شعر کے لفظ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر تلتے ہیں اور وہ اس طرح کہ متحرک کے مقابلے میں متحرک اور ساکن کے مقابلے میں ساکن لا کر دیکھتے ہیں۔

(۱۴) حرکت و سکون۔ زیر زبر اور پیش کو حرکت کہتے ہیں اور جس حرف پر حرکت ہوتی ہے اسے متحرک کہتے ہیں اور جس پر کوئی حرکت نہیں ہوتی اسے ساکن کہتے ہیں۔ اُردو میں حرکت لکھنے میں نہیں آتی مگر پڑھنے میں آتی ہے۔

اقسامِ نظم

(۱۵) نظم۔ ہر کلام موزوں کو نظم کہتے ہیں لیکن عرفِ عام میں ان اشعار کے مجموعے کو نظم کہتے ہیں جو کسی عنوان پر لکھے جاتے ہیں، ہم وزن بھی ہوتے ہیں اور مضمون بھی مسلسل ہوتا ہے۔ اور غزل کی طرح ہر شعر کے آخر میں قافیہ ہوتا ہے۔ اور ردیف بھی ہو سکتی ہے۔ ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم کی ایک مشہور نظم کے چار شعر یہ ہیں۔

---

[1] قافیہ و ردیف اور وزن و تقطیع کے متعلق مفصل معلومات میری کتاب فن شاعری میں ملاحظہ فرمائیے۔ اخلاق دہلوی۔

اٹھو! مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو — کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوز یقین سے — کنجشکِ فرمایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سلطانیِ جمہور کا آتا ہے زمانہ — جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی — اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو

نظم کے لیے اشعار کی تعداد مقرر نہیں۔ نظم کبھی مسدس اور کبھی مثنوی کے رنگ میں بھی ہوتی ہے۔

(۱۶) غزل۔ غزل کے معنی ہیں عورتوں سے باتیں کرنا۔ جوانی کی کیفیات کا ذکر کرنا اور عشق و محبت کا قصہ بیان کرنا۔ غزل کا رنگ عموماً عاشقانہ اور صوفیانہ ہوتا ہے اس کے علاوہ اخلاقی، قومی اور وطنی مضامین بھی ہو سکتے ہیں۔ غزل کے ہر شعر کا مضمون جداگانہ اور مکمل ہوتا ہے۔ درد و اثر غزل کے لیے ضروری ہے۔ غزل کے تین حصے ہوتے ہیں ۱۔ مطلع ۲۔ مقطع اور درمیانی حصہ۔ قافیے کی پابندی ہے۔ ردیف کی پابندی نہیں۔ اگر ہو تو کلام کا حسن بڑھ جاتا ہے۔

درد و اثر کے اعتبار سے میر تقی میرؔ سب سے آگے ہیں۔ پھر غالبؔ اور ان کے بعد آتشؔ ہیں۔ خواجہ میر دردؔ نے غزل میں تصوف داخل کیا۔ اور یحییٰ امان جرات نے معاملہ بندی داخل کی۔ حالیؔ اور چکبستؔ نے وطنی اور قومی مضامین سے زینت بخشی۔ غزل میں کم سے کم پانچ اور زیادہ سے زیادہ سترہ شعر ہوتے ہیں اور تعداد میں طاق ہوتے ہیں۔

غزل

چاندنی چٹکی ہوئی ہے جلوہ فگن نور ہے — تختہ گل ہو بہو جنت نگاہِ طور ہے
یہ بہار گل بداماں ہے ریاضت کا ثمر — ورنہ گلشن کی فضا صحرا سے کوسوں دور ہے

وہ کبھی آئے تو آئے صورتِ برق وشرر جلوہ فرمائی سے ان کی دل مرا مسرور ہے

پھر وہ حسنِ دلبستاں گل پوشِ آرائش ہوا پھر فضائے بوستاں رشکِ بہارِ طور ہے

جس سے خفتہ ملک میں احساسِ بیداری ہوا

بالیقین اخلاقؔ وہ صبحِ وطن کا نور ہو ہے

(۱۷) دوغزلہ وسہ غزلہ۔ کبھی ایک غزل لکھ کر اسی زمین [1] میں قافیہ بدل کر یا اسی ردیف وقافیہ میں دوسری اور کبھی تیسری غزل بھی کہتے ہیں۔ اور اپنی غزل کے آخر میں اگلی غزل کی طرف اشارہ بھی کر دیتے ہیں۔ دو غزلیں ہوں تو دوغزلہ اور تین ہوں تو سہ غزلہ کہتے ہیں۔ غالبؔ کے ایک دوغزلہ کا یہ مطلع ہے۔

شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا شعلہ جوالہ۔ ہر اک حلقہ گرداب تھا

(۱۸) غزل مسلسل۔ وہ غزل جس کے اشعار میں مضمون مسلسل ہو۔ اور ایک شعر کا دوسرے شعر سے چولی دامن کا ساتھ ہو۔ اُردو میں ایسی غزلیں بہت کم ہیں۔ نواب یوسف علی خاں ناظمؔ مرحوم والی رامپوری کی ایک مسلسل غزل کا یہ مطلع ہے۔

میں نے کہا کہ دعوئ الفت مگر غلط کہنے لگے کہ ہاں غلط اور کس قدر غلط

(۱۹) معاملہ بندی۔ معشوق کے ساتھ برابری کرنا۔ خودداری کو چھوڑ کر برابری کی گفتگو کرنا۔ پست اور بازاری محبت کا اظہار کرنا۔ اور شاعری میں جرأت اس رنگ کے موجد سمجھے جاتے ہیں۔ ناسخؔ وآتشؔ کے عہد میں اس رنگ نے رواج پایا۔ اور داغؔ نے بھی اسی رنگ کو اپنایا۔

صاف ہو جائے پھر ہو گفتگو بھی صاف صاف جس قدر تکرار ہے یہ رنجش باہم ہے

[1] کسی غزل کے وزن و بحر کو زمین کہتے ہیں۔ کبھی ردیف وقافیہ کو بھی شامل سمجھا جاتا ہے۔

(۲۰) خمریات۔ جن اشعار میں شراب وشاہد۔ بادہ ساغر عیش وسر مستی اور گل وگلزار وغیرہ کا ذکر ہوتا ہے۔ انھیں خمریات میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس رنگ کے اشعار اُردو کے ہر شاعر کے کلام میں ملتے ہیں۔ صفائی اور جستگی اسکا جوہر سمجھا جاتا ہے۔

کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سوداؔ ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا ئیں

(۲۱) ریختی۔ وہ غزل جس میں خیالات وجذبات کا اظہار عورتوں کی طرف سے ہو اور ان ہی کی زبان میں ہو۔ ریختی کا موجد سعادت یار خاں رنگینؔ کو بتایا جاتا ہے مگر ریختی کا وجود قدیم شعرائے دکن کے کلام میں بھی ملتا ہے اور اس کی داغ بیل سوزؔ کے کلام میں ملتی ہے۔ جان صاحب اس رنگ کے مشہور شاعر گزرے ہیں۔ ریختی میں پست اور فحش خیالات کی ترجمانی کی جانے لگی تھی۔ اس لیے ریختی بدنام ہوگئی ہے ورنہ بہت مفید صنف سخن ہے۔

میں تو وہ اوڑھنے کی نہیں کل کی اوڑھنی باجی مجھے اڑھاؤ چھلا چھل کی اوڑھنی
بھیجا ہے گوٹ کا یہ دوپٹہ چہ خوش اور آپ اوڑھ بیٹھیں مسلسل کی اوڑھنی

بھاری نیت منگاوے کہ رنگیںؔ لگاؤں میں
سر پر مرے ٹھہرتی نہیں ہلکی اوڑھنی

(۲۲) قصیدہ۔ وہ نظم جس میں کسی کی تعریف یا کسی کی ہجو (برائی) بیان کی گئی ہو قصیدے میں تعریف وہجو کے علاوہ فلسفیانہ اور اخلاقی مضامین بھی ہوتے ہیں الفاظ شان دار مضامین بلند، خیالات دقیق ونازک ہوتے ہیں۔ دل پسند تشبیہات اور دل پذیر استعارات ہوتے ہیں۔ گویا کہ بلاغت قصیدے کا جوہر ہے اشعار کم سے کم اُنیس اور زیادہ کی کوئی پابندی نہیں۔

سودا قصیدے کے استاد مانے جاتے ہیں۔ ان کے بعد ذوق اور پھر امیر مینائی۔ قصیدہ اُردو میں زیادہ نہیں چل سکا۔ قصیدے کے پانچ حصے ہوتے ہیں۔

(ا) تمہید یا تشبیب ۔ اس میں کوئی کیفیت یا کوئی سماں نظم کیا جاتا ہے۔

(ب) گریز۔ وہ اشعار جن کی مدد سے اصل مطلب کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔

(ج) مدح یا ہجو ۔ وہ اشعار جن میں تعریف یا برائی کی جائے۔

(د) دعا۔ وہ اشعار جن میں مدح کے ساتھ دعا اور ہجو کے ساتھ بددعا کی جائے۔

(ہ) خاتمہ۔ وہ اشعار جو قصیدے کے ختم ہونے کو ظاہر کریں۔ ان میں اکثر شاعر اپنا مطلب ظاہر کرتا ہے۔ اختصار کی غرض سے بطور نمونہ ایک ایک شعر لکھا جاتا ہے۔

اُٹھ گیا بہمن ودے کا چمنستان سے عمل (تمہید) تیغ اردی نے کیا ملکِ خزاں مستاصل

نسبت اس فصل کو پر کیا ہے سخن سے میرے (گزیز) ہے فضا اس کی تو دو چار ہے دن میں فیصل

سایہ میں دست کرم کے ترے ہر صبح ومسا (مدح) دولتِ ہر دو جہاں سے ہو غنی عبدِ اقل

چاہتا ہے کرے آخر وہ دعائیہ پر (دعا) نظم تجھ مدح کی بہتر اِز کلام اوّل

غرض احوال ہی اپنا ہے مجھے اس سے غرض (خاتمہ) تا بہ آخر جو یہ موزوں میں کیا ازاوّل

جس قصیدے میں تمہید نہیں ہوتی اسے خطابیہ بھی کہتے ہیں۔ قصیدے میں مطلع بھی ہوتا ہے اور مقطع بھی اور ردیف وقافیہ کی پابندی ہوتی ہے۔

(۲۳) قطعہ۔ وہ نظم جس میں مطلع نہ ہو۔ باقی شکل غزل اور قصیدے جیسی ہوتی ہے مقطع بھی ہوتا اور ردیف وقافیہ کی پابندی بھی ہوتی ہے مضمون مسلسل ہوتا ہے۔ ایک شعر کا تعلق دوسرے شعر سے ہوتا ہے۔ قطعہ میں پند ونصیحت وغیرہ ہر قسم کے مضامین ہوتے ہیں۔ قطعہ میں کم سے کم دو شعر اور زیادہ سے زیادہ سترہ شعر ہوتے ہیں۔ لیکن

زیادہ کی کچھ پابندی نہیں کی جاتی۔ جتنی ضرورت ہوتی ہے اتنے ہی شعر کہے لیے جاتے ہیں۔

قطعہ

خوشی کے ترانے خبر دے رہے ہیں　　سحر جلوہ بخشے جہاں عید ہوگی
مگر جن گھر کے لٹ چکے ہیں انھیں کیا　　جہاں عید ہوگی وہاں عید ہوگی

(۲۴) رُباعی۔ اس میں دو شعر یا دو بیتیں ہوتی ہیں اس لیے اس کو دو بیتی بھی کہتے ہیں اور ترانہ بھی کہتے ہیں۔ چار مصرع ہوتے ہیں۔ پہلے دوسرے اور چوتھے مصرع کا ہم قافیہ ہونا ضروری ہے اگر تیسرا بھی ہم قافیہ ہو تو بہتر ہے۔ البتہ چوتھے مصرع کا زوردار ہونا ضروری ہے۔ اکثر اساتذہ نے رُباعیاں کہی ہیں۔ میر تقی میرؔ۔ انیسؔ و دبیر اور خواجہ حالی کی رُباعیاں مشہور ہیں۔

پیری چلی اور گئی جوانی اپنی　　اے دردؔ کہاں ہے زندگانی اپنی
کل اور کوئی بیاں کرے گا اسکو　　کہتے ہیں اب آپ ہم کہانی اپنی

(۲۵) مثنوی۔ یہ ایک طویل نظم ہوتی ہے اس میں حسن و عشق کی داستان رزم و بزم کی کیفیت اور فرضی تاریخی اور اخلاقی قصّے نظم کیے جاتے ہیں، یہ نظم اُردو میں بہت کارآمد سمجھی جاتی ہے۔ مضمون مسلسل ہوتا ہے ہر شعر کے دونوں مصرع ہم قافیہ ہوتے ہیں گویا کہ ہر شعر بیت ہوتا ہے۔ قافیہ کی پابندی ہے۔ ردیف کی پابندی نہیں۔ اگر ہو تو کچھ مضائقہ نہیں۔ مثنوی کے لیے سات وزن مقرر ہیں۔[1]

---

[1] اوزان کی تفصیل میری کتاب فن شاعری میں ملاحظہ فرمائیے۔ اخلاقؔ حسین دہلوی

مثنوی میں پہلے حمد ہوتی ہے۔ پھر قصہ بیان کیا جاتا ہے۔ خاتمہ پر ان چیزوں کو دہرایا جاتا ہے جن پر قصے کا دارومدار ہوتا ہے۔ اُردو میں مثنویوں کا خاتمہ عموماً نصیحت پر ہوتا ہے اور ناقص ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مثنوی ڈرامہ کی کمی کو پورا کرتی ہے۔ مگر یہ بات صحیح نہیں ہے کیوں کہ مثنوی میں نہ تو باقاعدہ پلاٹ ہوتا ہے اور نہ مکالمہ ہی ہوتا ہے اور نہ واقعات ہی ایسے ہوتے ہیں جنھیں علمی جامہ پہنایا جا سکے۔

اُردو میں مثنوی کے موجد میر تقی میرؔ ہیں۔ میر حسن کی مثنوی سحر البیان یا قصہ بدر منیر اور پنڈت دیا شنکر نسیمؔ کی مثنوی گلزارِ نسیم اور خواجہ حالیؔ کی مثنویاں بہت مشہور اور مقبول ہیں۔

(۲۶) مرثیہ۔ وہ نظم ہے جس میں کسی مرے ہوئے آدمی کی خوبیاں بیان کی جائیں خصوصاً حضرت امام حسینؓ کی شہادت کے واقعات پر جو نظم لکھی جاتی ہے اسے مرثیہ کہتے ہیں اور چوں کہ کسی مرے ہوئے آدمی سے نفع کی اُمید اور نقصان کا خوف نہیں ہوتا۔ اس لیے مرثیہ میں جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ اخلاص اور سچی محبت پر مبنی ہوتا ہے لہٰذا اخلاقی اعتبار سے مرثیہ بہت اعلیٰ درجے کی نظم سمجھی جاتی ہے۔

مرثیہ میں مناظرِ قدرت، بہادری کے کارنامے اور اخلاقی خوبیوں کا بیان ہوتا ہے۔ مرثیے کا میدان بہت وسیع ہے۔ ہر قسم کے اعلیٰ مضامین اس میں نظم ہو سکتے ہیں۔ مرثیہ بہت قدیم صنفِ سخن ہے۔ عرب میں اس کی ابتدا ہوئی۔ ایران میں بھی اسے مقبولیت حاصل ہوئی۔ پھر ہندستان میں اس کا رواج ہوا۔ دکن کے قدیم شاعروں نے بھی مرثیے کہے ہیں۔

پہلے زمانے میں مرثیے کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ اور مثل مشہور تھی کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو اور بگڑا گویا مرثیہ خواں۔ مرثیہ پہلے مربع لکھا جاتا تھا۔ مرزا سوداؔ نے

مسدس میں لکھنا شروع کیا۔ میر انیس اور مرزا دبیر نے عروج کمال کو پہنچا دیا۔ اور اس کہاوت کو غلط کر دکھایا۔ خواجہ حالی نے بھی کئی اچھے مرثیے لکھے ہیں۔ مرثیہ غالب ان کا مشہور مرثیہ ہے۔

(۲۷) نوحہ۔ وہ مرثیہ جو مستزاد کی طرز میں لکھا جائے۔

بانو نے یہ اصغر سے کہا گود کے پالے۔ او گیسوؤں والے
یوں پڑ گیا تو شمر ستم گر کے پالے۔ او گیسوؤں والے

(۲۸) سلام۔ وہ مرثیہ جو غزل یا قصیدہ کی طرزِ میں لکھا جائے۔ اس میں سلام سلامی یا مجری وغیرہ کوئی لفظ ضرور لایا جاتا ہے۔

اے سلامی ہے اثر جذبِ دل بیتاب میں
شاہِ سکیں جلد کیا بیٹی کے آئے خواب میں

(۲۹) شہر آشوب۔ وہ نظم جس میں کسی شخص کسی خاندان کسی ملک یا کسی شہر کی تباہی اور بربادی کے حالات ہوں۔ اس میں نہایت درد انگیز اور اندوہناک مضامین ہوتے ہیں۔ سودا کے شہر آشوب پسندیدہ اور مشہور ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی تباہی کے بعد بھی شہر آشوب کہے گئے تھے جو فغانِ دہلی کے نام سے ۱۳۱۳ھ میں کتابی صورت میں چھپ چکے ہیں۔

(۳۰) واسوخت۔ وہ نظم جس میں عاشق اپنے معشوق کی بیوفائی اور ظلم و ستم اور رقیب کے ساتھ بیجا تعلق کی شکایت کرتا ہے۔ جدائی اور ہجر کی مصیبتوں کو بیان کرتا ہے اور معشوق کو دھمکیاں دیتا ہے۔ امانت لکھنوی اس رنگ کے استاد مانے جاتے ہیں اور واسوخت امانت بہت مشہور ہیں۔ جو کتابی شکل میں چھپ چکی ہیں۔

(۳۱) تاریخ۔ وہ نظم ہے جس میں کسی واقعہ کی تاریخ حروف ابجد کے حساب سے نکالی جاتی ہے۔ حروف ابجد کے اعداد مقرر ہیں اور وہ ہیں۔

ا	ب	ج	د	ہ	و	ز	ح	ط	ی	ک	ل	م	ن	س	ع	ف	ص
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰	۲۰	۳۰	۴۰	۵۰	۶۰	۷۰	۸۰	۹۰

ق	ر	ش	ت	ث	خ	ذ	ض	ظ	غ
۱۰۰	۲۰۰	۳۰۰	۴۰۰	۵۰۰	۶۰۰	۷۰۰	۸۰۰	۹۰۰	۱۰۰۰

ناسخ لکھنوی نے میر تقی میر کی تاریخ وفات اس مصرع سے نکالی تھی۔

واویلا مُرد شہ شاعراں

اس مصرع سے ابجد سے حساب سے ۱۲۲۵ھ نکلتا ہے۔

(۳۲) نعت۔ وہ نظم جس میں پیغمبر اسلام یا کسی اور پیغمبر کی تعریف ہو۔

(۳۳) حمد وثنا۔ وہ نظم جس میں خدا کی تعریف ہو۔

(۳۴) منقبت۔ وہ نظم جس میں ولیوں اور بزرگوں کی تعریف ہو۔

(۳۵) سہرا۔ وہ نظم جس میں کسی سہرا کی خوبیاں بیان کی گئی ہوں۔

(۳۶) تہنیت۔ وہ نظم جس میں مبارک بادی کا مضمون ہو۔

(۳۷) ساقی نامہ۔ وہ نظم جس میں شراب وشاہد۔ جام ومینا۔ نغمہ وسرود۔ کیف وسر مستی اور گلزار کا مضمون ہو اور مسلسل ہو۔ اس میں عموماً ساقی کو مخاطب کیا جاتا ہے۔ ساقی نامہ گو مستقل نظم کی حیثیت رکھتا ہے لیکن مثنویوں میں بعض عنوانات کی ابتدا بھی ساقی نامہ ہی سے کی جاتی ہے۔ ؎

اُٹھا ساقیا پردہ اس ساز سے
لڑا دے ممولے کو شہباز سے

شرابِ کہن پھر پلا ساقیا
وہی جام گردش میں لا ساقیا

(۳۸) مسمط ۔ وہ نظم ہے جس میں اشعار بند کی صورت میں ہوں ۔ اس کی شکل یہ ہے کہ پہلے کئی مصرع جو ہم وزن اور ہم قافیہ ہوں ۔ انھیں ایک بند قرار دیں اور پھر کئی اور مصرع ہم وزن جمع پہلے کے ہم قافیہ نہ ہوں ۔ البتہ ہر بند کا آخری مصرع پہلے بند کے مصرعوں کا ہم قافیہ ہو ۔ خواہ پہلے بند ہی کے آخری مصرع کو دہرا دیں ۔ اس کی نو قسمیں ہیں

(ا) مثلث ۔ وہ مسمّط ہے جس کے ہر بند تین مصرع ہوں ۔ پہلے تین مصرع ہم وزن اور ہم قافیہ ہوں ۔ باقی بندوں میں صرف تیسرا مصرع پہلے بند کا ہم قافیہ ہو اور دو مصرع آپس میں الگ ہم قافیہ ہوں ۔ خواہ پہلے بند کا آخری مصرع دہرا دیا گیا ہو ۔

دینا ہے سرا اس میں تو بیٹھا مسافر ہے　　اور جانتا ہے یاں سے جانا تجھے آخر ہے
کچھ راہِ خدا دے جا ۔ جا تیرا بھلا ہوگا

جو رب نے دیا تجھ کو تو نام پہ رب کے دے　　جو یاں نہ دیا تو نے کیا دیوے گا واں بندے
کچھ راہِ خدا دے جا ۔ جا تیرا بھلا ہوگا

(ب) مربع ۔ وہ مسمّط ہے جس کے ہر بند میں چار مصرع ہوں ۔ پہلے بند کے چاروں مصرع ہم قافیہ ہوں ۔ باقی بندوں میں تین مصرع الگ ہم قافیہ ہوں اور چوتھا مصرع پہلے بند کا ہم قافیہ ہو ۔ خواہ آخری مصرع ہی دہرا دیا گیا ہو ۔

تنے گا مسرت کا اب شامیانہ
بجے گا محبت کا نقار خانہ
حمایت کا گائیں گے مل کر ترانہ
کرو صبر آتا ہے اچھا زمانہ

نہ ہم روشنی دن کی دیکھیں گے لیکن
چمک اپنی دکھلائیں گے اب بھلے دن
رُکے گا نہ عالم ترقی کیے بن
کرو صبر آتا ہے اچھا زمانہ

(ج) مخمس۔ وہ مسمط جس کے ہر بند میں پانچ مصرع ہوں۔ پہلے بند میں پانچوں مصرع ہم قافیہ ہوں اور باقی بندوں میں چار مصرع الگ ہم قافیہ ہوں اور پانچوں مصرع پہلے کا ہم قافیہ ہو۔ خواہ آخری دہرادیا گیا ہو۔

جب اے راحت جان تجھ سے جدا رہتا ہوں
کیا کہوں سخت مصیبت میں پھنسا رہتا ہوں
مضطر و ششدر و حیران و خفا رہتا ہوں
کسی چرچے میں تو مشغول میں کیا رہتا ہوں
منہ لپیٹے ہوئے دن رات پڑا رہتا ہوں

کیا بیاں اپنی جوانی کا کروں میں غمگیں
طاقت اب بسترِ اندوہ پہ ہلنے کی نہیں
نہ تو بیٹھوں ہوں نہ اُٹھتا ہوں نہ جاتا ہوں کہیں
یاد کر کے تری صحبت کو بس اے پردہ نشیں
منہ لپیٹے ہوئے دن رات پڑا رہتا ہوں

(د) مسدّس۔ وہ مسمط ہے جس کے ہر بند میں چھ مصرع ہوں پہلے چار مصرع ہم قافیہ ہوں پھر دو مصرع ہم قافیہ ہوں۔ مرثیہ کو مسدّس میں لکھنا مرزا سودا کی ایجاد ہے۔ خواجہ حالی کی مسدّس مدوخزرِ اسلام نہایت مشہور اور مقبول مسدّس ہے۔

ہوا کچھ وہی جس نے یاں کچھ کیا ہے ۔۔۔ لیا جس نے پھل بیج بو کر لیا ہے

۱؎ ہد یا، یہ لفظ صحیح وِدّیا ہندی کا ہے۔ یعنی علم و ہنر

کرو کچھ کہ کرنا ہی کچھ کیمیا ہے مثل ہے کہ کرتے کی سب بدیا ہے

یونہیں وقت سو سو کے ہیں جو گنواتے

وہ خرگوش کچھوؤں سے ہیں زک اٹھاتے

(ہ) مسبع ۔ وہ مسمط جس کے ہر بند میں سات مصرع ہوں۔ پہلے بند کے ساتوں مصرع ہم قافیہ ہوں۔ باقی بندوں میں چھ مصرع الگ ہم قافیہ ہوں اور ساتواں مصرع پہلے بند کا ہم قافیہ ہو۔

(و) مثمن ۔ وہ مسمط جس کے ہر بند میں آٹھ مصرع ہوں اور قاعدہ مذکورہ کے مطابق ہوں۔

(ز) متسع ۔ وہ مسمط جس کے ہر بند میں نو مصرع ہوں اور قاعدہ مذکورہ کے مطابق ہوں

(ح) معشر ۔ وہ مسمط جس کے ہر بند دس مصرع ہوں اور قاعدہ مذکورہ کے مطابق ہوں آخر کی چاروں قسمیں اُردو میں نہیں چلتیں اس لیے ان کی مثالیں بھی کمیاب ہیں۔

(۳۹) مستزاد ۔ وہ نظم ہے جس کے ہر مصرع کے آخر میں کچھ موزوں لفظ بڑھا دیئے جائیں۔

یاروں میں نہ تھا کوئی مروت جو کرے ۔۔۔۔۔۔ اُجڑے تھے گھر

تاحدِ نظر صاف پڑے تھے میداں ۔۔۔۔۔ عرصہ تھا تنگ

(۴۰) ترکیب بند ۔ وہ نظم ہے جس میں کئی بند ہوں اور ہر بند کے اشعار ہم وزن اور ہم قافیہ ہوں اور ہر بند کے بعد ایک بند ہو جس کا قافیہ الگ ہو جو ایک بند کو دوسرے بند سے الگ کر دے۔ اگر ایک ہی بیت ہر بند کے بعد آئے تو اس نظم کو ترجیع بند کہتے ہیں

اور اگر ہر بند کے بعد بیت بدلتی رہے تو اس نظم کو ترکیب بند کہتے ہیں۔

(۴۱) ترجیع بند۔ وہ نظم ہے جس میں کئی بند ہوں اور ہر بند کے اشعار ہم وزن اور ہم قافیہ ہوں اور ہر بند کے بعد ایک بند ہو جس کا قافیہ الگ ہو جو ایک بند کو دوسرے بند سے الگ کردے۔ اگر ایک ہی بیت ہر بند کے بعد آئے تو اس نظم کو ترجیع بند کہتے ہیں اور اگر ہر بند کے بعد بیت بدلتی رہے تو اس نظم کو ترکیب بند کہتے ہیں۔

متعلقات

(۴۲) دیوان۔ کسی شاعر کی غزلوں کے مجموعہ کو دیوان کہتے ہیں۔

(۴۳) کلیات۔ کسی شاعر کے ہر قسم کے کلام کے مجموعہ کو کلیات کہتے ہیں۔ کلیات غزل، رُباعی، قصیدہ اور قطعہ وغیرہ پر مشتمل ہوتا ہے۔

(۴۴) تذکرہ۔ وہ کتاب جس میں شاعروں کے حالات زندگی کلام کی خصوصیات اور نمونہ کلام ہو۔ میر تقی میرؔ نے سب سے پہلے اُردو کے شاعروں کا تذکرہ لکھا تھا۔

(۴۵) گلدستہ۔ کئی شاعروں کی غزلوں وغیرہ کے مجموعہ کو گلدستہ کہتے ہیں۔ یہ عموماً ان غزلیات کا مجموعہ ہوتا ہے جو کسی مشاعرے میں مختلف شاعر پڑھتے ہیں۔

(۴۶) مشاعرہ۔ وہ محفل جس میں شاعر اور شعر فہم حضرات جمع ہو کر کلام سنیں اور سنائیں اور اچھے کلام کی تعریف کریں۔ مجلس مشاعرہ کو شعر و سخن کی ترقی کا بہترین طریقہ سمجھا جاتا ہے۔



اصنافِ نثر

نثر۔ وہ عبارت یا گفتگو جو لکھنے یا کہنے والے نے نظم کے ارادے سے نہ لکھی ہو اور نہ کہی ہو لہٰذا اگر کوئی فقرہ نظم نکل گیا ہو تو وہ نثر ہی سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً۔
پہاڑوں پر چیڑ اور صنوبر کے درخت ایسے خوش نما لگتے ہیں کہ گھنٹوں دیکھئے اور وجد کیجئے سامنے اونچی اونچی برف سے لدی پھندی پہاڑیاں ہیں۔ کسی طرف دھنواں سا اُڑ رہا ہے۔[1]

خط کشیدہ آخری جملہ کلامِ موزوں ہے لیکن کہنے والے نے جان بوجھ کر اس کو موزوں نہیں کیا ہے۔ بلکہ اتفاقیہ موزوں ہو گیا ہے۔ اس لیے یہ بھی نثر میں شمار ہو گا۔

الفاظ کے اعتبار سے نثر کی قسمیں

(۱) مسجّع [2] ۔ وہ نثر ہے جس میں وزن ہو اور فقرے کا آخری لفظ قافیہ ہو۔ مثلاً۔
در پر دھوپ کا سایہ بد ساعت کا بنایا۔۔۔۔۔۔۔۔۔
سجع ہم وزن الفاظ کو کہتے ہیں۔ مسجّع میں شعر کا وزن نہیں ہوتا۔ بلکہ دو دو فقروں کے لفظ آپس میں ہم وزن ہوتے ہیں۔ مگر ہم قافیہ صرف آخری لفظ ہوتے ہیں۔

---

[1] نسیم البلاغت میں اس فقرے کا وزن لکھا ہے۔ فاعلن ، مفاعلین ، فعولن۔ اس میں پہلے رکن کا وزن غلط ہے۔ اس کا صحیح وزن یہ ہے۔ مفاعلن ، مفاعیلن ، فعولن ۔ اس وزن کو بحر ہزج مسدّس مخدوف کہتے ہیں۔ [2] نثر مسجّع کی قسمیں ضائع لفظی میں زیر عنوان نثر میں سجع لکھی جا چکی ہیں۔

نثر مسجع کے ہر فقرے میں کم سے کم دو اور زیادہ سے زیادہ پچیس لفظ ہو سکتے ہیں اور جب دونوں فقرے برابر نہ ہوں تو دوسرے فقرے کو پہلے فقرے سے بڑا ہونا چاہیئے ورنہ عیب سمجھا جاتا ہے۔[1]

جب نثر مسجع کے دونوں فقروں کے لفظ ہم وزن اور ہم قافیہ ہوتے ہیں تو اِس نثر کو نثر مرصع کہتے ہیں۔ مثلاً۔

سیرت کی بھلائی بیان سے باہر۔ صورت کی صفائی گمان سے بڑھ کر۔ سیرت میں سنجیدگی۔ صورت میں پسندیدگی۔۔۔۔۔۔۔

(۲) مرجز۔ وہ نثر ہے جس میں وزن ہو اور قافیہ نہ ہو۔ مثلاً

قامت موزوں کے سامنے سرورِ رواں ناچیز ہے۔ کاکل پیچاں کے سامنے مشکِ ختن بے قدر ہے۔۔۔۔۔۔۔۔

ان دونوں فقروں میں لفظ ہم وزن تو ہیں لیکن ہم قافیہ نہیں ہیں۔ اس لیے یہ نثر مرجز ہے۔

مسجّع اور مرجّز میں فرق

مرجز میں صرف وزن ہوتا ہے اور مسجّع میں وزن کے علاوہ فقرے کا آخری لفظ ہم قافیہ ہوتا ہے۔

---

[1] یہ رائے ان کی ہے جو مقفیٰ اور مسجّع میں فرق جرنے اور مسجّع میں وزن نہیں مانتے۔

[2] نسیم البلاغت میں نثر مقفیٰ کا ذکر نہیں کیا ہے اور نثر مقفےٰ کے اوصاف نثر مسجّع میں داخل کر دیئے ہیں کیوں کی بعض لوگ نثر مسجّع اور نثر مقفیٰ میں فرق نہیں کرتے۔

قافیہ ہوتا ہے۔ باقی اور کسی لفظ میں نہ قافیہ ہوتا ہے اور نہ وزن

(۳) مقفیٰ ۲ ۔ وہ نثر ہے جس میں قافیہ ہو اور وزن نہ ہو۔ فقرے کا آخری لفظ ہم۔ مثلاً

تقصیر معاف ہو۔ بڑے نا انصاف ہو۔ کل کی بات بھول گئے

جو آج پھول گئے۔ خوش تقریر ہو۔ مگر بڑے شریر ہو۔

نثر مقفیٰ کے فقروں میں کم سے کم دو لفظ اور زیادہ سے زیادہ بیس لفظ ہو سکتے ہیں دونوں فقروں کا مساوی ہونا خوبی کی بات ہے۔ ورنہ دوسرا فقرا پہلے سے بڑا ہو سکتا ہے مگر دوسرے فقرے کا پہلے سے چھوٹا ہونا عیب ہے۔

مسجّع اور مقفیٰ میں فرق

مسجّع اور مقفیٰ میں یہ فرق ہے کہ مسجّع میں وزن بھی ہوتا ہے اور مقفیٰ میں وزن نہیں ہوتا ورنہ قافیے کے اعتبار سے دونوں یکساں ہیں۔

(۴) عاری۔ وہ نثر ہے جس میں نہ قافیہ ہو اور نہ وزن ہو۔ البتہ فصاحت و بلاغت اور سنجیدگی و متانت میں اعلیٰ درجے کی ہو۔ گویا کہ نثر عاری نہ مسجّع ہوتی ہے نہ مرجز ہوتی ہے اور نہ مقفیٰ ہوتی ہے بلکہ ان سب سے الگ ہوتی ہے۔ مثلاً۔

راجہ ٹوڈرمل نے مسلمان افسران کو ہندی زبان اور ہندو محاسبوں کو فارسی زبان سیکھنے کی سخت تاکید کی اور حکم دے دیا۔

معنیٰ کے اعتبار سے نثر کی قسمیں

(۱) دقیق۔ وہ نثر ہے جس کے معنیٰ مشکل سے سمجھ میں آئیں اور اس میں ایسے لفظ استعمال کیے گئے ہوں جو مانوس اور مروج کم ہوں اور اگر تشبیہات واستعارات ہوں تو وہ ایسے ہوں جو آسانی سے سمجھ میں نہ آئیں۔ مثلاً۔

بلمس اظفار فیض آثار۔ محبت عظمطم۔ صدیق عشمشم

(۲) سلیس۔ وہ نثر ہے جس کے معنیٰ آسانی سے سمجھ میں آجائیں اور اس میں ایسے لفظ استعمال کیے گئے ہوں جو مانوس اور مروج ہوں۔ اور اگر تشبیہات و استعارات ہوں تو وہ بھی ایسے ہوں جو آسانی سے سمجھ میں آجائیں۔ مثلاً۔

برس کی آخری رات کو ایک بڈھا۔ اپنے اندھیرے گھر میں اکیلا بیٹھا ہے۔ رات بھی اندھیری اور ڈراؤنی ہے۔

نثر سلیس کی قسمیں

(۱) سلیس سادہ۔ وہ نثر ہے جو آسان و عام فہم ہو۔ روزمرہ اور محاورہ کا مناسب استعمال ہو۔ اگر تشبیہات واستعارات ہوں تو وہ بھی ایسے ہوں جو آسانی سے سمجھ میں آجائیں۔ مثلاً۔

دانش مند کا تقاضا یہ ہے کہ انتظار کرنے اور مجبور ہو جانے سے پہلے کام شروع کردیں۔

(۲) سلیس رنگین۔ وہ نثر ہے جو آسان و عام فہم بھی ہو اور اس میں رنگینی اور دلآویزی بھی ہو۔ مثلاً۔

فصاحت کے پھول کو دیکھا کہ قدرتی بہار میں حسنِ خداداد کا جوبن دکھا رہا ہے۔

نثر دقیق کی قسمیں

(۱) دقیق سادہ۔ وہ نثر ہے جس کے معنیٰ آسانی سے سمجھ میں نہ آئیں اور اس میں زیادہ مناسبات اور مشکل تشبیہات واستعارات بھی نہ ہوں۔ مثلاً۔

مواد جسم انسانی کی تفتیش ایسا عقدۂ لاینحل ہے۔
جیسے کوئی فرد ایسی منزل ظلمات میں قطع الارض کرے۔

(۲) دقیق رنگین۔ وہ نثر ہے جس کے معنیٰ مشکل سے سمجھ میں آئیں اور اس میں مناسبات اور مشکل اور دور از فہم تشبیہات واستعارات سے کام لیا گیا ہو۔ مثلاً۔

طوطی شکرستان شیریں زبانی۔ ملبل چمن زار رنگین بیانی صبیہ نی نقود کمال دستہ بند رنگینی مقال بانی نبائے فصاحت۔۔۔۔۔۔۔

اوصافِ نثر

ہر طرح کی نثر میں تین قسم کے اوصاف ہوتے ہیں۔

(۱) عالمانہ۔ لفظ اور معنیٰ۔ ترکیبیں بہت زیادہ دقیق اور مشکل نہ ہوں۔ اور تحقیق لغت اور استعارات وکنایات سے مالا مال ہوں جیسے دقیق سادہ نثر ہوتی ہے۔

(۲) شاعرانہ۔ لفظ ومعنیٰ۔ ترکیبیں اور بندشیں سب کی سب شاعرانہ اور رنگیں ہوں اور تشبیہات واستعارات اور صنائع لفظی ومعنوی سے آراستہ ہوں جیسے سلیس رنگین اور دقیق رنگین نثر ہوتی ہے۔

(۳) منشیانہ۔ روزمرہ اور محاورہ کے مطابق ہو اور کمال سادگی اور سلاست کے باوجود دلکش و دلفریب ہو۔ اور جادو کا سا اثر رکھتی ہو۔ جیسے سلیس سادہ نثر ہوتی ہے۔

نکتہ۔ نثر کے باب میں یہ نکتہ یاد رکھنے کے لائق ہے کہ نثر ہمیشہ موضوع (عنوان) کے ماتحت ہے۔ اگر موضوع ہلکا پھلکا ہے تو عبارت بھی سہل و آسان اور عام فہم ہونی چاہئے اور اگر موضوع سنجیدہ اور علمی و تحقیقی ہے تو عبارت بھی برجستہ رواں اور علمی و فنی اصطلاحات سے مالا مال ہونی چاہیئے یہی انشا پردازی کا بڑا گُر ہے۔ جو اس گُر سے واقف ہے اور اس سے برمحل کام لیتا ہے اس کی تحریر کو نگاہِ قبول سے دیکھا جاتا ہے۔ ورنہ نہیں۔

رُوحِ بلاغت

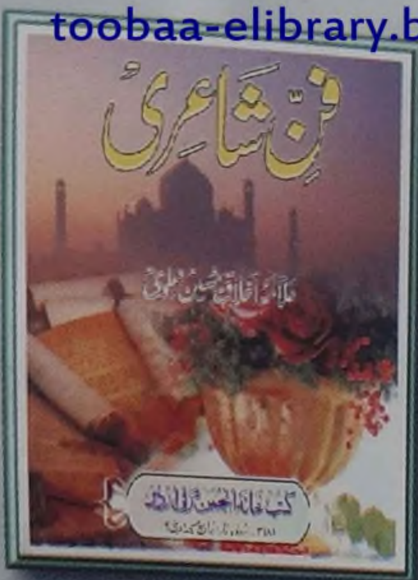
علامہ اخلاق حسین دہلوی

اس خلاصہ میں بلاغت کے پیچیدہ مسائل کو اس طرح سلجھا کر عام فہم بنا دیا ہے کہ یاد کرنے اور سمجھنے میں ذرا زحمت نہیں ہوتی۔ مثالیہ اشعار دل آویز پُر لطف اور شگفتہ ہیں۔ اسلوب بیان سلیس اور ترقی یافتہ ہے۔ ایسا جامع اور سہل خلاصہ اس سے پہلے کبھی شائع نہیں ہوا۔ قیمت۔ -/۴۰ روپے

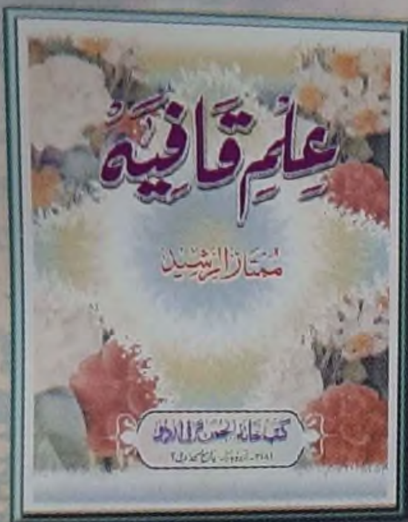
میزانِ سخن

علامہ اخلاق حسین دہلوی

مولانا حسرت موہانی کی نادر کتاب " نکاتِ سخن " کا بہترین خلاصہ ہے۔ یہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے۔ ۱۔ متردکاتِ سخن ۲۔ معائب سخن ۳۔ محاسنِ سخن جس کا مطالعہ شعروادب کے محاسن ومعائب پر عبور حاصل کرنے کے لیے بیحد ضروری ہے بعض اہم چیزیں جن کی ضرورت مطالعہ کرنے والے کو پیش آتی ہیں اور اصل کتاب میں نہیں۔ خلاصہ نگار نے نہایت اختصار کے ساتھ انھیں فٹ نوٹ میں لکھ دیا ہے۔ قیمت۔ -/۴۰ روپے

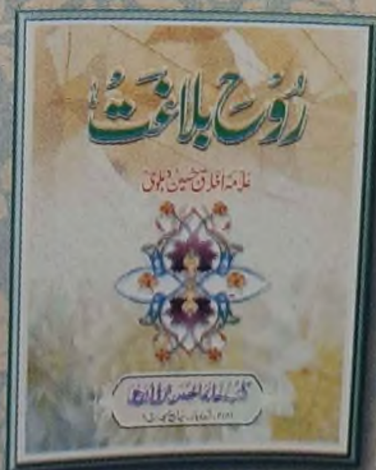












HANA ANJUMAN-E-TARAQQI-E-URDU
du Bazar, Jama Masjid, Delhi-6 (India)
Ph.:011-23276526
E-mail: kkatu@indiatimes.com

